بلالؓ

عبّاس محمود العقّاد

ترجمہ
شیخ محمد احمد پانی پتی

ادارہ فروغِ اُردو، لاہور

طابع : نقوش پریس لاہور
پرنٹر : محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور

قیمت : دو روپے چار آنے

بلالؓ

(علامہ اقبالؒ)

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا ۔۔۔ حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا

ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی ۔۔۔ تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لئے ۔۔۔ کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لئے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں

ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری ۔۔۔ شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا ۔۔۔ اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا ۔۔۔ ترے لئے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید ۔۔۔ خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر   کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند

چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری   کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی   نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا

خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

ترتیب

پیش لفظ

(از مترجم)

سابقہ عالمگیر جنگوں کے بعد مختلف عوامل کے نتیجے میں امریکہ، یورپ، افریقہ اور ایشیا میں نسلی امتیاز کے مسئلے نے بڑی شدت اختیار کر لی ہے۔ بعض جگہ اس مسئلے کے پس منظر میں مقامی حالات کام کرتے نظر آتے ہیں اور بعض علاقوں میں سیاست کی کارفرمائیوں کی بدولت اسود و احمر کے درمیان گہری خلیج حائل ہو چکی ہے۔ اور دانش ورانِ عالم کو اس کے پُر کرنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمینِ عرب میں بھی یہ مسئلہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما نظر آتا تھا۔ عرب کے مقامی باشندوں میں حسب و نسب کا غرور اوجِ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ بے بس اور بے کس غلام تو خیر ان کے نزدیک انسانوں کی صف میں

بھی شمار ہونے کے قابل نہ تھے۔ لیکن دوسری آزاد و خود مختار اقوام کی بھی وہ اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے اور از راہِ تحقیر انھیں عجمی (گونگے) کہہ کر پکارتے تھے۔ عین اس زمانے میں اسلام کا ظہور ہوا جس نے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کا اعلان کر کے کالے اور گورے، آزاد اور غلام، عرب اور عجم کی تمیز یکسر ختم کر دی اور اس طرح حقیقی مساوات کو پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے روشناس کرایا۔ اسی بے نظیر تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام کی آواز پر سب سے پہلے جن لوگوں نے لبیک کہا۔ ان میں غلاموں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ یہ لوگ اسلام قبول کرنے کی پاداش میں اپنے مالکوں کے ہاتھوں سخت ظلم سہتے اور ہر قسم کی ذلتیں برداشت کرتے تھے۔ لیکن جس راہ کو انھوں نے اپنے لئے اختیار کر لیا تھا۔ اس سے وہ سرِ مو انحراف کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کا نام زبان پر آتے ہی ہر مسلمان کا سر فرطِ عقیدت سے جھک جاتا ہے۔

انہی غلاموں میں ایک غلام بلالؓ بن رباح بھی تھے۔ جن کا چہرہ تو بالکل سیاہ تھا لیکن دل نورِ ایمان سے پوری طرح منور تھا۔ یہی وہ عظیم شخصیت تھی جسے اپنے اخلاص مودت اور عشق و محبت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا موذن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حضور سرورِ کائنات سے انھیں جو تعلقِ خاطر تھا۔ اس کا اندازہ کرنا ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔ حضور پُرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ان سے جس شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ دنیا کی نظروں

میں تو بلالؓ حقیر غلام تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا اور صحابہ انھیں جس درجہ احترام اور تقدیس کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس سے بڑے بڑے باجبروت فرمانروا اور شہنشاہ بھی محروم ہیں۔

ایسے وقت میں جبکہ نسلی امتیاز کا عفریت بظاہر مہذب کہلانے والی اقوام پہ بُری طرح مسلط ہے اور انسانی اقدار بُری طرح پامال کی جا رہی ہیں۔ ایسی کتاب کی اشاعت یقیناً سودمند ثابت ہو گی۔ جس میں اس تابناک دور کی بعض جھلکیاں دکھائی گئی ہوں جب مساواتِ انسانی پوری طرح جلوہ گر تھی اور عظیم الشان سلطنتوں اور بڑے بڑے شہنشاہوں کو خاطر میں نہ لانے والے لوگ ادنیٰ غلاموں کی دست بوسی کرنا فخر خیال کرتے تھے۔ اسی مقصد اور غرض کو پیشِ نظر رکھ کر مصر کے مشہور فلسفی ادیب اور مورخ عباس محمود العقاد نے یہ کتاب تالیف کی ہے اور اس میں سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ایمان افروز اور روح پرور واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ آج کل کی مہذب اقوام کے اس سلوک پر بھی روشنی ڈالی ہے جو وہ پس ماندہ اقوام کے ساتھ روا رکھ رہی ہیں۔ اس تقابل سے معلوم ہو سکے گا کہ اسلامی تہذیب اور موجودہ مغربی تہذیب میں کس قدر بعد المشرقین ہے اور اسلام نے دنیا کی مظلوم اقوام کو جن حقوق و مراعات سے نوازا ہے۔ یورپ کی 'مہذب' اقوام نے ان کا عشر عشیر بھی انھیں عطا نہیں کیا۔

محمد احمد پانی پتی

نسلی امتیاز کا مسئلہ

نسلی امتیاز کے مسئلے کو آج کل جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں متعدد اہلِ قلم اسی مسئلے کے متعلق سینکڑوں کتابیں تالیف کر چکے ہیں اور بین الاقوامی اجتماعات میں دُنیا بھر کے مفکرین اور سیاست دان اس کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ موجودہ زمانے ہی میں پیدا ہُوا ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے بھی یہ مسئلہ موجود تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب سے دُنیا مختلف قبائل اور گروہوں میں منقسم ہُوئی ہے۔ یہ مسئلہ کسی نہ کسی شکل میں دُنیا کے سامنے چلا آرہا ہے۔

نسل کا انگریزی ترجمہ (RACE) ہے۔ مغربی مفکرین اس کا ماخذ عربی لفظ راس (سر) کو قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں اور دیگر حیوانوں میں مابہ الامتیاز

صرف عقل و خرد ہے جس کا تمام تر تعلق سر اور دماغ سے ہوتا ہے۔ اسی امر کو مدِ نظر رکھ کر لفظ رأس سے (RACE) بنا لیا گیا۔

ابتدا میں قبائل اور اقوام کے باہمی اختلاف اور ایک دوسرے پر اظہارِ تفاخر نے اتنی مکروہ شکل اختیار نہ کی تھی جتنی آج ہمیں نظر آتی ہے۔ علم الاجتماع کے ماہرین نے لکھا ہے کہ آغاز میں جب انسانوں نے وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے اجتماعی زندگی بسر کرنی شروع کی اور لوگ قبیلوں اور گروہوں میں بٹ کر ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے میں مصروف ہو گئے تو اس وقت قبائلی اختلاف محض اظہارِ تعارف کا ایک ذریعہ تھا۔ مختلف قبائل میں منقسم ہونے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو بآسانی پہچان لیتے تھے اور یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں شخص فلاں گروہ اور قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی حقیقت کو آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔

(ترجمہ) اے لوگو! ہم نے تم میں سے بعض کو مرد اور بعض کو عورتیں بنایا ہے۔ اسی طرح تمھیں مختلف گروہوں اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن یہ اختلاف محض اس لیے ہے کہ تم ایک دوسرے کو آسانی سے پہچان سکو۔ ورنہ تم میں سے

نگرانی میں دوسرے مدارس میں بھیجا۔

حقر کی ولادت : احقر کی پیدائش بر مکان ماموں شاہ محمد مرحوم بمقام عمروال بلہ تحصیل نکودر ضلع جالندھر ۱۳۱۲ھ یا ۱۳۱۳ھ بمطابق ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ ۱۳۱۲ھ کے اعتبار سے تاریخی نام "محمد مظفر" (۱۳۱۲ھ) "چراغ حق ہے" (۱۳۱۲ھ) ۱۳۱۳ھ/کے اعتبار سے تاریخی نام راغب علی۔ میرے ایک دوست مولانا قمر الدین صاحب اس وقت پڑھتے تھے۔ ایک شعر کہا تھا۔

محمد مظفر چراغ

بحق فی علومک فی الدیار

بچپن کا زمانہ عمروال بلہ میں ایسا بے ہوشی کا کھیل کود میں گزرا کہ کوئی بات یاد نہیں، تخمیناً سات سال کی عمر میں والدین چک نمبر ۲۵۲ (گ ب) ضلع لائلپور (اب ضلع فیصل آباد) میں گئے اور ہم دونوں کو ہمراہ لے گئے۔

زمانہ درس : اس چک کے امام حافظ پیر محمد (نابینا) تھے۔ تقریبا پہلا پارہ میں نے ناظرہ ان سے پڑھا پھر چند سال وہاں ٹھہر کر وطن واپس ہوئے۔ عمروال بلہ کی مسجد میں ایک امام صاحب تھے۔ ان سے ناظرہ اٹھارہ پارے پڑھے۔ اس وقت میری عمر تقریباً دس سال تھی۔ بعد ازاں ماموں صاحب سے اردو کی سرکاری کتابیں اور تاریخ کی کتابیں پڑھیں۔ ساتھ ہی لکھنا اور حساب بھی سیکھا۔

نکودر : پھر ماموں صاحب نے شروع شوال ۱۳۲۳ھ بمطابق ۱۹۰۵ء میں مدرسہ رشیدیہ نکودر ضلع جالندھر میں داخل کرادیا اور اس مدرسہ میں فارسی کی ابتدائی کتابیں شعبان ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۷ء تک پڑھیں۔ اسی سال حضرت گنگوہی قدس سرہ کا انتقال ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اور اسی سال طاعون ہوا جس میں میرے دو بڑے بھائی فوت ہوئے اور میرا نکاح بھی شریعت کے مطابق برادری کی تمام رسوبات سے خالی اسی سال ہوا۔

رائے پور گوجراں : پھر مدرسہ صابریہ رائے پور گوجراں ضلع جالندھر حضرت مولانا فضل احمد صاحب کے پاس داخلہ ہوا جو ہمارے گاؤں سے ایک میل تھا۔ صبح وہاں جاتا، شام کو گھر آجاتا تھا۔ حضرت مولانا فقیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہاں دوسرے سال مدرس ہوگئے۔ شوال ۱۳۲۴ھ سے تقریبا ماہ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ تک ابتدائی عربی کتابیں صرف، نحو، فقہ، منطق وفلسفہ وادب کی پڑھیں۔ حضرت مولانا فضل احمد صاحب بہت نیک طینت، حلیم الطبع، عالم ربانی مدرسہ عبد الرب دھلی کے فارغ تھے اور شیخ طریقت مولانا شاہ عبد الرحیم قدس سرہ سے متوسل تھے۔

پانچ رجب ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۶۴ء ۶۵ سال کی عمر میں (چک ۱۱، ایل نزد چیچہ وطنی) رحلت فرمائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا فقیر اللہ رحمۃ اللہ علیہ : حضرت مولانا فقیر اللہ مرحوم نے ابتدائی کتب اور متوسط اپنے وطن میں اور مدرسہ نعمانیہ لاہور میں پڑھ کر پھر سہارن پور مدرسہ مظاہر علوم اور دار العلوم دیوبند میں تین چار سال داخلہ لیا۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے سند فراغ حاصل کی اور حضرت موصوف دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہوئے۔

بہت باشریعت پرہیزگار عالم دین تھے۔ استاذ شفیق مہربان تھے۔ تقریباً ۵۰ سال دین کی تعلیم اور افتاء کی خدمت کرکے

معزز شخص وہی کہلائے گا جس میں تقویٰ اور خدا ترسی موجود ہوگی (محض کسی
خاص قبیلے یا خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کوئی شخص معزز کہلائے
جانے کا مستحق نہ ہوگا)

انسانی فطرت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو ہر لحاظ
سے دوسروں سے برتر دیکھنا چاہتا ہے۔ حسب و نسب کے غرور کی بنیاد بھی اسی
جذبۂ برتری پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے ہر قوم اپنی شرافت اور عالی نسبی
پر کم و بیش فخر کرتی چلی آئی ہے۔ اگر کوئی قوم کسی زمانے میں سطوت و شوکت اور
غلبہ و اقتدار کی حامل رہ چکی ہو تو لازماً دوسری اقوام کی نسبت فخر و مباہات کا اظہار
زیادہ شدت سے کرے گی۔ خواہ اس کے غلبے اور اقتدار کا زمانہ ہنوز برقرار ہو
یا گزر چکا ہو۔ اگر غلبہ کا زمانہ برقرار ہوگا۔ تب تو فخر و مباہات کی ایک جائز وجہ اس کے
پاس ہوگی۔ لیکن غلبہ و اقتدار سے محرومی کی صورت میں بھی وہ دیگر اقوام کی نظروں میں
اپنے آپ کو معزز و مکرم ثابت کرنے کی خاطر عظمت رفتہ اور شوکت پارینہ کا ذکر
بڑھ چڑھ کر کرے گی۔

غرضیکہ دنیا کے کسی بھی خطے کے لوگ اپنی قوم، ملک اور شہروں پر فخر و مباہات
کا اظہار کرنے اور دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرنے میں دوسروں سے کم نہیں
ہیں۔ چنانچہ انہی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

بِلَادِي وَإِنْ جَارَتْ عَلَيَّ عَزِيزَةٌ   وَأَهْلِي وَإِنْ ضَنُّوا عَلَيَّ كِرَامُ

(اگرچہ ابنائے وطن کے ذریعے مجھے بہت تکلیفیں پہنچی ہیں۔ تاہم ان تکالیف کے باوجود میرا وطن مجھے دوسرے تمام شہروں سے زیادہ عزیز ہے۔ اسی طرح اگرچہ میرے عزیزوں نے مجھ پر ظلم وستم توڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تاہم اس کے باوجود میرے نزدیک وہ دوسروں سے زیادہ قابلِ احترام ہیں)

دُنیا کی جس قوم کو بھی لے لیں، ہمیں یہی نظر آئے گا کہ وہ اپنے آپ کو دوسری تمام اقوام سے معزز اور برتر سمجھتی ہوگی۔

قدیم مصری یہ سمجھتے تھے کہ دُنیا میں انسانیت کا کامل نمونہ ہیں تو وہ۔ باقی تمام اقوام وحشی ہیں اور تہذیب وتمدن اور شرافت اور شائستگی سے کوسوں دور۔

اہلِ عرب سمجھتے تھے کہ شرافت اور نجابت میں ان کا کوئی ہم پلّہ نہیں۔ ان کے سوا باقی تمام لوگ گونگے (عجمی) ہیں جنھیں نہ بات کرنے کی تمیز ہے اور نہ بات سمجھنے کا سلیقہ۔

یہی حال اہلِ ایران، ہنود اور اہلِ چین کا تھا۔ ان میں سے ہر قوم اپنے آپ کو ہر لحاظ سے برتر اور دیگر تمام اقوام کو اپنے سے کم تر سمجھتی تھی۔ ہر قوم متعدد قبائل پر مشتمل ہوتی ہے۔ فخر ومباہات کا یہ جذبہ ان قبائل میں بھی جاری وساری تھا اور ہر قبیلہ حسب ونسب کے لحاظ سے دوسرے قبائل سے بہت زیادہ قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو زیادہ معزز ومکرم اور برتر واعلیٰ سمجھتا تھا۔

موجودہ زمانے کی مہذب کہلانے والی اقوام میں بھی برتری کا یہ جذبہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہے اور یورپی اقوام اپنے سوا دنیا کی دوسری تمام اقوام کو پس ماندہ اور غیر مہذب قرار دے کر اپنے جذبہ تفاخر کی تسکین کا سامان مہیا کرتی رہتی ہیں۔ چونکہ یہ اقوام نسل اور عقیدے کے لحاظ سے ایک ہیں۔ اس لئے فخر و مباہات کی تمام تر بنیاد عادات و اخلاق اور روایات پر ہوتی ہے۔ اس معاملے میں اطالوی، ہسپانوی اور فرانسیسی اقوام سب سے بڑھ کر ہیں۔ تاہم اہل یورپ کا یہ خاصہ ہے کہ آپس میں تو ہر قوم اپنے آپ کو دوسری اقوام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن غیر یورپی اقوام کے مقابلے میں کوئی قوم اپنے آپ کو جداگانہ حیثیت دینے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ یورپین کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ اہل یورپ غیر یورپی اقوام کے سامنے اپنی فضیلت اور برتری کا ایک معیار پیش کرتے ہیں اور وہ ہے ان کا سفید نسل سے تعلق جس میں تمام یورپی اقوام مشترک ہیں۔

دیگر اقوام کو غیر مہذب سمجھنے اور اپنے آپ کو تہذیب کے بلند مقام پر خیال کرنے کے باعث اہل یورپ اپنے آپ کو اقوام عالم کا محافظ بھی سمجھنے لگے ہیں۔ وہ برملا اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ دیگر اقوام کو تہذیب سکھانا اور آئین معاشرت سے آگاہ کرنا یورپینوں کے فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی نوآبادی کی آزادی کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو مغربی طاقتیں بالعموم یہ کہہ کر اسے آزادی دینے سے انکار کر دیتی ہیں کہ ابھی یہ نوآبادی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے اس مرتبہ پر نہیں

پہنچی کہ علیحدہ مملکت بن جانے کی صورت میں اپنی آزادی اور خود مختاری کو ہر لحاظ سے برقرار رکھ سکے۔ جب ہماری تعلیم و تربیت کے نتیجے میں اس قوم کے اندر تہذیب کا صحیح شعور پیدا ہو جائے گا۔ تب اُن کی آزادی کے متعلق غور و فکر کیا جا سکتا ہے

مشہور انگریز مفکر جولین ہکسلے اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوتے لکھتا ہے کہ مغربی اقوام کی یہ ذہنیت موجودہ زمانے کی پیداوار نہیں ہے بلکہ زمانہ قبل از مسیح سے ان کی یہی ذہنیت چلی آ رہی ہے اور وہ اپنے آپ کو انسانیت کا محافظ خیال کر کے دوسری اقوام کو اپنے زیر تسلط لانے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ قبل ازیں بنی اسرائیل میں بھی یہی ذہنیت کارفرما تھی اور وہ نہ صرف اپنے آپ کو دنیا کی افضل ترین قوم سمجھتے تھے بلکہ ان کے خیال میں دنیا کی دیگر تمام اقوام بھی ہدایت کے لیے ان کی رہنمائی کی محتاج تھیں۔ ان کے نبی بھی انھیں یہی تلقین کرتے رہتے تھے کہ اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھو اور دوسری قوموں کو اپنا محتاج خیال کرو۔ چنانچہ یسعیاہ نبی اپنی کتاب کے انچاسویں باب میں اپنے متعلق فرماتے ہیں :

"اے جزیرو! میری سنو۔ اے امتو! جو دور ہو کان لگاؤ۔ خداوند نے مجھے رحم ہی سے بلایا۔ بطنِ مادر ہی سے اُس نے میرے نام کا ذکر کیا اور اُس نے میرے مُنہ کو تیز تلوار کی مانند بنایا اور مجھ کو اپنے ہاتھ کے سایہ تلے چھپایا۔ اُس نے مجھے تیر آبدار کیا اور اپنے ترکش میں مجھے چھپا رکھا۔ اور اُس نے مجھ سے کہا تو میرا خادم ہے۔ تجھ میں اے اسرائیل!

میں اپنا جلال ظاہر کروں گا۔ تب میں نے کہا۔ میں نے بے فائدہ مشقت اُٹھائی۔ میں نے اپنی قوّت بے فائدہ بطالت میں صرف کی تو بھی یقیناً میرا حق خداوند کے ساتھ اور میرا اجر میرے خُدا کے پاس ہے۔ چونکہ میں خداوند کی نظر میں جلیل القدر ہوں اور وہ میری توانائی ہے۔ اس لئے وہ جس نے مجھے رحم ہی سے بنایا تاکہ اُس کا خادم ہو کر یعقوب کو اس کے پاس واپس لاؤں اور اسرائیل کو اس کے پاس جمع کروں۔ یُوں فرماتا ہے۔ ہاں خداوند فرماتا ہے کہ یہ تو ہلکی سی بات ہے کہ تو یعقوب کے قبائل کو برپا کرنے اور محفوظ اسرائیلیوں کو واپس لانے کے لئے میرا خادم ہو۔ بلکہ میں تجھ کو قوموں کے لئے نُور بناؤں گا کہ تجھ سے میری نجات زمین کے کناروں تک پہنچے .....‘‘

یورپی اقوام کی برتری کے دعوے دار انہی مثالوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ ہمارا جذبۂ تفاخر دُنیا کی نظروں میں کتنا ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہو۔ بہرحال بنی اسرائیل سے کم تر ہی ہے۔ اس لئے ہم پر اعتراض کرنا اور اُمم ماضیہ کے کردار و افعال اور جذبات و احساسات سے آنکھیں بند کر لینا مناسب نہیں۔

پہلے زمانے میں نسلی تفوق کا دعویٰ کرنے والے اپنی تائید میں کوئی ٹھوس اور منطقی دلیل پیش کرنے کی زحمت گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا فلاں

قوم اور نسل سے ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم دوسروں سے ہر لحاظ سے فائق اور برتر ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے دعوے خود ان کے لئے وجہ تسلی ہوں تو ہوں لیکن دوسری اقوام بلا دلیل اُن کے دعوے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھیں۔

البتہ جب یورپ میں علوم و فنون کی گرم بازاری شروع ہوئی تو بعض دیگر علوم کے ساتھ "علم الحیات" BIOLOGY بھی ایجاد ہوا جس کے ذریعے ہم امم ماضیہ کے طرز بود و باش، عادات و اطوار اور ذہنی رجحانات کا پتا با سانی لگا سکتے ہیں۔

اس علم کے ماہرین نے دُنیا بھر کی اقوام کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) سفید نسل کی اقوام، جو یورپ کے خطہ میں آباد ہیں۔
(۲) سیاہ فام اقوام، جن کا تعلق سرزمین افریقہ سے ہے۔
(۳) زرد رنگ کی اقوام، جو وسط ایشیا سے تعلق رکھتی ہیں۔
(۴) گندمی رنگ والی اقوام، جو مشرق بعید میں سکونت رکھتی ہیں۔
(۵) سُرخ اقوام یعنی امریکہ کے اصلی باشندے۔

بعض ماہرین نے اقوام عالم کو پانچ کی بجائے صرف تین زمروں میں تقسیم کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ زرد، گندم گوں اور سُرخ رنگ کی اقوام در اصل ایک ہی شاخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ماہرین اپنے نظریے کی تائید میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

اُنیسویں صدی میں جہاں ایک طرف یورپ میں نسلی اختلافات پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری تھا۔ وہاں دوسری طرف استعماریت کا عفریت بھی اپنا دامن پھیلا رہا تھا اور علم کو سیاسی جھگڑوں اور استعماری اغراض کے لیئے بے دریغ استعمال کیا جا رہا تھا۔ کثرت سے ایسا لٹریچر شائع ہونے لگا۔ جس میں نسلی عصبیت کا پروپیگنڈہ ہوتا تھا۔ جابجا ایسے لیڈر پیدا ہونے لگے جو اقوام یورپ کو اس امر کا احساس دلانے لگے کہ وہ دنیا جہان کی قوموں سے افضل اور علوم و فنون، ثقافت اور تہذیب تمدن میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان لیڈروں میں پیش پیش فرانس کے آرتھر ڈی جوبینیو اور جرمنی کے انگریزی نژاد ہوسٹن چیمبرلین تھے۔ امریکہ میں بھی نسلی امتیاز کا مسئلہ پوری شدت سے موجود تھا اور یورپی آبادکار جو سفید رنگ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں کے اصلی باشندوں RED INDIANS اور حبشیوں کو محض اختلاف رنگ و نسل کی بنا پر ادنیٰ حقوق و مراعات دینے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ امریکہ میں نسلی امتیاز کے علم برداروں میں لوتھروپ سٹوڈرڈ LATHROP STODDARD اور ماڈیسون گرانٹ MADISON GRANT کا نام سرفہرست ہے۔

سفید اقوام کی رنگ دار اور سیاہ فام اقوام سے نفرت کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو موخر الذکر سے ہر لحاظ سے برتر اور فائق اور دوسروں کو پسماندہ اور غیر مہذب خیال کرتی تھیں بلکہ ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دور جمہوریت کی نشو و نما

کا دور تھا اور جہاں استعماریت زوروں پر تھی۔ وہاں اقوام عالم میں مساوات کا رجحان بھی نشو و نما پا رہا تھا۔ نسلی برتری کے حامی یہ خیال کرتے تھے کہ اگر تمام اقوام کو مساوی سمجھنے کا رجحان زور پکڑ گیا تو ایک دن ایسا آئے گا جب ان کی برتری خاک میں مل جائے گی اور وہ بھی دوسری اقوام کے ساتھ ایک سطح پر آ جائیں گے

یورپی اقوام اپنے آپ کو ایشیائی اقوام ہی سے برتر خیال نہ کرتی تھیں بلکہ ان میں آپس میں بھی منافست کا جذبہ پورے زوروں پر تھا۔ جرمن اپنے آپ کو دوسری یورپی اقوام سے ہر لحاظ سے برتر خیال کرتے تھے۔ فرانسیسی اپنے مدِ مقابل کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ انگریزوں کا بھی یہی حال تھا۔ تاہم جرمن جذبۂ مفاخرت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور ایرین نسل (جس سے جرمن تعلق رکھتے تھے) کی برتری کا نشہ ان میں اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ حالیہ جنگ عظیم تک بھی دُور نہ ہو سکا۔ نپولین کے عہد میں فرانسیسیوں اور جرمنوں کی جنگ کے نتیجے میں اس جذبہ نے اور بھی شدت اختیار کر لی اور جرمن لیڈروں نے قوم کے افراد کو قومی اور نسلی برتری کا احساس دلا کر ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انھوں نے بار بار اپنی قوم کو اس طرف توجہ دلائی کہ اگر جرمن قوم نے اپنی حیثیت اور عظمت کو نہ پہچانا تو دشمن یقیناً ان پر مکمل غلبہ حاصل کر لے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ فرانسیسیوں کو اس وقت جرمنوں کے مقابلے میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور ان کی بنا پر جرمنوں کو جس ذلت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کے ازالہ کی صرف یہی صورت ہے کہ جرمن قوم اپنی عظمت اور

۹۷۳۴

سربلندی کی خاطر متحد ہو جائے۔

پہلی جنگ عظیم میں بھی جرمنوں کو اتحادیوں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس موقعہ پر بھی جرمن لیڈروں نے اپنی قوم کو ابھارنے اور ہزیمت اور ناکامی کا داغ دھونے کے لیے اسی نسلی برتری اور آرین قوم کی عظمت اور سربلندی کے فلسفے کا سہارا لیا۔ وہ جانتے تھے کہ جرمن قوم حالیہ شکست کے بعد اس حد تک پژمردہ ہو چکی ہے کہ جب تک قومی عظمت کا احساس ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر نہ بھر دیا جائے گا اور انھیں یہ یقین نہ دلا دیا جائے گا کہ ان کی قوم دنیا کی دوسری تمام قوموں سے ہر لحاظ سے افضل اور دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں حکومت کرنے کی زیادہ اہل ہے۔ اس وقت تک وہ پستی اور ذلت کے گڑھے سے نہیں نکل سکتے۔ جرمن لیڈروں نے ببانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ جرمن قوم کے خمیر میں شکست کھانا نہیں ہے کیونکہ وہ تو پیدا ہی حکومت کرنے اور دنیا کی دوسری قوموں پر اپنا تسلط قائم کرنے اور برتری ثابت کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ اگر اسے عارضی طور پر اپنے دشمنوں کے مقابلے میں شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اس کی وجہ جرمن قوم کی کمزوری نہیں بلکہ بعض بدنہاد لوگوں بالخصوص یہودیوں کی غداری ہے۔ انھوں نے ایک طرف تو جرمن قوم کے دل میں اپنی عظمت اور سربلندی کا شدید احساس پیدا کر دیا۔ دوسری طرف اس کے دل میں دوسری قوموں سے نفرت اور عداوت کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ اس طرح انھوں

نسلی برتری کے مسئلے کو ایک باقاعدہ فلسفہ کی تشکیل دے دی جس کا اثر جرمن قوم کی سیاست، اخلاق اور فنون و آداب پر گہرا پڑا۔ وہ کہتے تھے کہ حکومت ایک فطری ملکہ ہے جو بعض خاص قوموں ہی کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ حکومت کی اہل صرف وہی قوم ہوتی ہے جسے خاص اس مقصد کے لئے پیدا کیا جائے۔ ایسی قوم میں حکومت کا ملکہ اسی طرح ودیعت کیا جاتا ہے جس طرح انسانی جسم کو اعضاء ودیعت کئے جاتے ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جرمن قوم میں نسلی برتری کا غرور پیدا کرنے میں سب سے بڑا حصہ اڈولف ہٹلر کا تھا جو آگے چل کر جرمنی کا آمرِ مطلق بنا۔ اُس نے جرمن قوم کو انتہائی نکبت اور پستی کی حالت میں پایا۔ لیکن اپنی پُرجوش تقریروں کے ذریعے اس میں قومی عظمت کا احساس پیدا کر کے تھوڑے ہی عرصے میں اس قابل کر دیا کہ وہ دُنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو چیلنج کرنے لگی۔

مندرجہ بالا سیاسی اور نفسیاتی عوامل کے باعث جرمن آرین قوم کی عظمت و شوکت کے اظہار میں مبالغہ کی آخری حدوں کو بھی پار کر گئے۔ نسلی اور قومی غرور میں غالباً دنیا کی کوئی قوم جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دُنیا کی ہر صنعت کو اُنھوں نے آرین قوم کی طرف منسوب کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا۔ تہذیب و تمدن کا حقیقی حامل اور جائز وارث اُنھوں نے آرین قوم ہی کو ٹھہرایا۔ سیاست اور حکومت کا مستحق اُنھوں نے آرین قوم کے علاوہ اور کسی کو نہ سمجھا۔ دُنیا کی دوسری تمام اقوام کو اُنھوں نے آرین قوم کا خوشہ چین اور محتاج خیال کیا۔

اپنی عظمت و شوکت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے جرمن یہ بھول گئے کہ جس آرین قوم پر انھیں اس قدر ناز ہے وہ نسلی لحاظ سے کبھی بھی ایک قوم نہیں رہی جس کے متعلق یہ خیال کیا جاسکے کہ اُس نے تہذیب و تمدّن کی ارتقائی منزلیں نسلاً بعد نسل طے کی ہیں اور اعلیٰ صفات اسے ورثے میں ملی ہیں۔ اس کے متعلق صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مختلف اقوام کا ایک مجموعہ تھی۔ جن کی زبان تو اصلاً ایک تھی مگر قومی خصائص اور تہذیب و تمدّن اور رسوم و رواج ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ ایرین قوم کی مثال آج کل کی ان اقوام کی طرح ہے۔ جن کی زبان تو بے شک ایک ہے۔ لیکن زبان کے علاوہ ان کے درمیان اور کوئی قدر مشترک نہیں حتیٰ کہ وطن اور رنگ کے لحاظ سے بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔

مشہور انگریز عالم جولین ہکسلے "عناصر انسانی اور یورپین اقوام" کے زیر عنوان اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ یورپ کی نسلی برتری کے علم برداروں کا یہ ادعا ہے کہ جرمن، آریہ اور یورپ کی شمالی اقوام ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور یہی اقوام تہذیب و تمدّن کے میدان میں ہمیشہ دوسری قوموں سے بڑھ چڑھ کر رہی ہیں۔ حالانکہ اسی خطے میں وہ قومیں بھی آباد ہیں جنھوں نے تہذیب و تمدن اور علم کے میدان میں کبھی کوئی نمایاں ترقی نہیں کی اور نہ ہی سائنس کی ایجادات میں ان کا کوئی حصّہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ دنیا کے ایک مخصوص خطّے ہی کو ہر لحاظ سے دنیا کی سیادت کا حق حاصل ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں کہ یورپ میں آج کل علم و ہنر کی جو گرم بازاری نظر آ رہی

ہے۔ وہ سب اسی خطے میں پروان چڑھی ہے۔ انگلستان میں پتھر کے زمانے کے بعض ایسے آثار دریافت ہوئے ہیں جو تین ہزار قبل مسیح کے ہیں۔ یہ آثار بحر روم کی قدیم ثقافت کو اجاگر کرتے ہیں جو جزیرہ نمائے آئبیریا (اندلس و پرتگال) اور فرانس کے راستے برطانیہ پہنچی۔ حالیہ تحقیق کے بعد یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تہذیب و تمدن کی طرف پہلا قدم یورپی اقوام کی بجائے ان اقوام نے اٹھایا تھا جو بحر روم کے ساحل کے گرد آباد تھیں۔ اس طرح یورپینوں کا یہ ادعا بھی باطل ٹھہرتا ہے کہ دنیا میں تہذیب و تمدن کی بنیاد انہی کے ہاتھوں پڑی تھی۔ یہ امر بھی متحقق ہے کہ ایک ہی خطے سے تعلق رکھنے والی اقوام بھی ذہنی اور علمی لحاظ سے ایک سطح پر نہیں ہوتیں۔ کوئی قوم ذہنی اور علمی لحاظ سے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتی ہے تو کوئی پستی کے غار میں گری ہوتی ہے۔ خود یورپی اقوام بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ تہذیب و تمدن اور علم پر کسی خاص قوم کو اجارہ داری حاصل ہے اور اسی لئے وہ دوسری اقوام کی نسبت عزت و شرف کی زیادہ مستحق ہے کسی صورت میں درست نہیں۔

دیگر اقوام کی طرح سیاہ فام اقوام بھی رنگ میں یکسانیت کے باوجود اخلاق و عادات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ سیاہ فام قبائل آسٹریلیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اخلاق و عادات اور رسوم و رواج کے لحاظ سے وہ افریقہ کے سیاہ فام حبشیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ خود افریقہ کے سیاہ فام قبائل میں بھی جو ایک ہی خطہ

میں آباد ہیں۔ کامل اتحاد اور یکسانیت نہیں ہے۔ بوشمان اور ہوتنتوت افریقہ کے دو مشہور قبیلے ہیں لیکن عادات وخصائل اور شکل وشباہت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ بوشمان پست قد، پھرتیلے اور صید وشکار کے بے حد شوقین ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہوتنتوت دراز قد اور دون ہمت ہیں اور جانور چرانے کے علاوہ انھیں اور کوئی کام نہیں آتا۔ انہی قبائل کے نزدیک جنوبی سوڈان میں بانتو کے قبائل آباد ہیں جن کے عادات وخصائل بھی اسی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں جس طرح بوشمان اور ہوتنتوت کے۔

متعدد شواہد سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتی بلکہ زمان ومکان کی تبدیلی سے اس کے عادات وخصائل رسوم ورواج اور تہذیب وتمدن میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ اسی لئے تہذیب کا پرچم کبھی کسی قوم کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور کبھی کسی دوسری قوم کے ہاتھ میں۔ یہی ایک امران لوگوں کے دعوے کو باطل کرنے کے لئے کافی ہے جو تمام بشری خوبیوں کو دنیا کی صرف ایک قوم سے مختص سمجھتے ہیں اور اپنے سوا دوسری تمام قوموں کو غیر مہذب پسماندہ اور اعلیٰ اخلاق سے عاری خیال کرتے ہیں۔

کسی قوم کے بیشتر اوصاف اس کے مقامی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی حالات کے تابع ہوتے ہیں اور انھیں انہی حالات کی روشنی میں جانچنا چاہئیے۔ یہ درست ہے

کہ قوموں کو بعض اوصاف ورثے میں بھی ملتے ہیں لیکن ورثے میں ملے ہوئے اوصاف دیرپا ثابت نہیں ہوتے اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان میں تبدیلی آتی جاتی ہے اور بالآخر وہ بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ یورپی مفکرّین کا دعویٰ ہے کہ اہلِ مغرب نے علم سے جتنا فائدہ حاصل کیا ہے۔ اہلِ مشرق نے نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ مغرب میں علم پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں اور ہر شخص اپنے نظریات دوسروں کے سامنے بلا جھجک اور بغیر کسی خوف و ہراس کے پیش کر سکتا ہے۔ لیکن مشرق میں علم پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ لوگوں کو نئے نظریات کی اشاعت سے بزور روکا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنوں پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور دماغ علم کی نئی نئی راہوں کو تلاش کرنے کے ناقابل ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آزادیٔ افکار کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ان مذہبی لیڈروں کی طرف سے پیدا کی جاتی ہے جو بعض مخصوص عقائد اور نظریات پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ کسی دوسرے عقیدے اور نظریے کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اپنے متبعین کے لئے بھی وہ یہ جائز قرار نہیں دیتے کہ وہ آبائی عقائد کو چھوڑ کر کسی نئے نظریے کو اختیار کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی نئی تحریک اُٹھتی ہے یا کسی حلقے کی طرف سے کسی نئے نظریے کو روشناس کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تو مذہبی لیڈروں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے اور اس نئے نظریے پر ایمان رکھنے والوں کو ملحد اور زندیق جیسے خطابات دے کر

لوگوں کو ان سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ جب سلطنت بھی کسی خاص مذہب کی پشت پناہی کر رہی ہوتی ہے۔ تب کسی نئے نظریے کا پنپنا محال ہوتا ہے۔ عقل و فکر پہ کڑا پہرہ لگا دیا جاتا ہے اور آزادیٔ فکر و نظر محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ کوئی سلطنت ایسے نظریات برداشت نہیں کر سکتی جو آگے چل کر اس کے لئے خطرے کا باعث ہوں۔ تاہم اس صورتِ حال کو کسی خطّے کی قومی خصوصیات سے کوئی تعلق نہیں یہ صورت دُنیا کے جس خطّے میں بھی پیدا ہو گی۔ اُسی جگہ آزادیٔ فکر و نظر پہ پابندی عائد ہو جائے گی خواہ مشرق ہو یا مغرب۔

یہ دُرست ہے کہ قدیم مشرقی اقوام میں کسی نئے فلسفے کو قبول نہ کرنے کا رجحان شدّت سے پایا جاتا تھا اور اسی لئے یونانی فلسفے کو ان علاقوں میں بار نہ مل سکا لیکن اس کی وجہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ تھی کہ ان اقوام پر مذہب کا بہت گہرا اثر تھا اور ان کے مذہبی رہنما اپنے مخصوص عقائد و نظریات کے علاوہ کسی نئے عقیدے اور نظریے کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ تاہم اقوامِ یورپ کو بھی ایک زمانے میں بعینہٖ اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مشرق کی طرح وہاں بھی آزادیٔ فکر و نظر پہ طرح طرح کی قیود عائد ہو گئی تھیں۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ جس زمانے میں یورپی اقوام پہ کلیسا کا اقتدار تھا اور پاپائے روم کو وہاں کے آمرِ مطلق کی حیثیت حاصل تھی تو کسی شخص کو رومن کیتھولک عقائد کے علاوہ اور کوئی عقیدہ اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی بدنصیب شخص جرأت کر کے لوگوں کے سامنے

بعض مخالف نظریات پیش کرتا تھا تو اسے کڑی سے کڑی سزائیں دی جاتی تھیں جن میں موت کی سزا بھی شامل تھی۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنوں پر جمود طاری ہو گیا اور لمبے عرصے تک وہاں علم کی نشوونما بالکل رکی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیسائے یورپ آغاز کار ہی میں ظلم و استبداد کی ان حدوں تک پہنچ گیا تھا۔ جہاں تک اہل مشرق صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی نہ پہنچ سکے تھے۔

بعض یورپی نقاد اپنی برتری کے جواز میں یہ امر بھی پیش کرتے ہیں کہ اہل مغرب شجاعت اور جوانمردی کے میدان میں بھی ایشیائی اور افریقی اقوام سے ہر لحاظ سے آگے ہیں اور انھوں نے متعدد جنگوں میں اپنے ایشیائی حریفوں کو قوت و طاقت اور تعداد میں کمی کے باوجود زبردست شکستیں دی ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ صلیبی جنگوں میں یورپ کی متحدہ افواج نے، جو ہر قسم کے سازوسامان سے لیس تھیں اور جنھیں اپنی کثرت تعداد پر بے حد غرور تھا، کمزور و نحیف اور اسلحہ سے تہی دست اہل مشرق کے ہاتھوں عبرت ناک شکست کھائی ہے۔ صلیبیوں نے ان جنگوں میں فوجوں کے مذہبی جذبات کو ابھارنے اور مشتعل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا اور یورپ کی تمام مسیحی اقوام نے سامان جنگ اور فوجوں کے ذریعہ ان کی بھرپور مدد کی تھی لیکن میدان جنگ میں اہل یورپ کی شان و شوکت اور فخر و مباہات ذرا بھی کام نہ آیا اور وہ بری طرح پسپا ہو کر حسرت کے ساتھ بے نیل مرام اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے۔

یورپی اقوام ایشیائی اقوام کے مقابلے میں اپنی نسلی برتری کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اہلِ فارس بھی آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اہلِ یورپ انھیں اپنی برادری میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ خود بھی رسوم و رواج، عادات و اخلاق اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے مغربی اقوام کے مقابلے میں ایشیا کی شمالی اقوام سے بہت زیادہ قریب ہیں حالانکہ اگر نسلی تعلق کا خیال رکھا جائے تو ایرانیوں کو ایشیائی اقوام کے مقابلے میں یورپی اقوام کے زیادہ قریب ہونا چاہیے تھا۔

آسٹریا کے ایک فاضل پروفیسر فریڈرک ہرٹز نے لکھا ہے کہ ازمنہ قدیمہ میں یورپی اقوام کا سیاہ فام اقوام سے نسلی اختلاط بھی رہا ہے اور یورپی اقوام یہ دعویٰ نہیں کر سکتیں کہ ان کی رگوں میں کسی غیر قوم کا خون موجود نہیں ہے۔ ہم نے اپنی ایک اور کتاب "ساعات بین الکتب" میں بھی نسلی تفوق کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اس کتاب سے بھی بعض ایسے اقتباسات درج کر دیئے جائیں۔ جن کا ہمارے موضوع سے کسی حد تک تعلق ہے۔ ہم نے لکھا تھا:

"متعدد شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ یورپی اقوام کا کسی زمانے میں حبشیوں سے گہرا نسلی تعلق رہا ہے۔ چنانچہ پرانے زمانے کے بعض انسانی ڈھانچے، جو جرمنی، بلجیم اور فرانس وغیرہ میں دستیاب ہوئے ہیں وہ بہت حد تک جنوبی افریقہ

کے باشندوں سے مشابہ ہیں۔ کوہ ایلپس کے علاقے کے باشندوں پر تو سیاہ فام اقوام کا اثر بلیبنی کے عہد تک معلوم ہوتا ہے۔

ہوسٹن چیمبرلین نے یورپی اقوام کی برتری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ آریائی اقوام کو جو فضیلت حاصل ہے وہ مشرق کی سامی اقوام کو حاصل نہیں کیونکہ موخر الذکر کا مقصود و مطلوب ہمیشہ جائز و ناجائز طریقے سے مال و دولت اکٹھا کرنا اور عیش و آرام کی زندگی گزارنا رہا ہے۔ ذہنی، علمی اور روحانی ترقی کی طرف انھوں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ اس کا جواب آسٹریا کے پروفیسر ہرٹز نے رومی اور حمورابی قوانین کا باہم مقابلہ کر کے خوب دیا ہے۔ ہر دو قوانین کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کونسا قانون تہذیب کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے اور کونسا قانون جنگل کے قانون کی یاد دلاتا ہے۔

پروفیسر ہرٹز نے لکھا ہے کہ رومی قانون کی رو سے قرضخواہوں کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ اگر مقروض ستائیس دن تک اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو وہ نہ صرف اسے قید کر کے سخت تکالیف دیں بلکہ مناسب سمجھیں تو اس کے بدن پر سے گوشت اتار کر اسے آپس میں تقسیم بھی کر لیں خواہ ایسا کرنے میں مقروض کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن حمورابی کے قانون کی رو سے قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں قرض خواہ کو صرف اس بات کی اجازت تھی کہ وہ تین سال تک مقروض سے مفت خدمت لے سکتا تھا۔ لیکن اس پر سختی کرنے اور

ظلم و ستم توڑنے کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ اسی طرح قانون حمورابی میں ایسے چور کے لیے
کوئی سزا مقرر نہ تھی جو انتہائی لاچاری کی صورت میں چوری کرنے پر مجبور ہوا ہو۔ لیکن
رومی قانون چور کو کسی صورت میں بخشنے کے لیے تیار نہ تھا۔ رومی قانون کے بموجب
والد کو اپنی اولاد فروخت کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن اہل بابل کے نزدیک یہ فعل جرم
تھا۔ حمورابی قانون کی رو سے شوہر کو بیوی کی اجازت کے بغیر کوئی لونڈی اپنے پاس
رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن رومیوں نے بیوی کو اس قسم کا کوئی حق نہ دیا ہوا تھا۔
بابلی قانون کی رو سے اگر مقروض کی زمین میں پیداوار کم ہوتی تو وہ قرض خواہ سے درخواست
کر کے اپنا قرض کم کرا سکتا تھا۔ لیکن رومی قانون مقروض سے کسی طرح کی نرمی برتنے
کے لیے تیار نہ تھا۔ ان مثالوں سے واضح ہو سکتا ہے کہ رومی قانون میں کس قدر سنگدلی
اور بے رحمی پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں حمورابی قانون کی بنیاد ہی رحم اور
نرم دلی پر رکھی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک یا علاقہ کا قانون وہاں کے باشندوں
کے جذبات و احساسات اور تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس امر میں
کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ جہاں اہل یورپ حد درجہ قسی القلب اور بے رحم
تھے وہاں اہل مشرق بے انتہا رحم دل اور انسانیت کی اعلیٰ صفات سے متصف تھے۔
چیمبرلین یونانیوں کو آسمان پر چڑھاتا ہے اور کہتا ہے کہ انہوں نے علوم و فنون
اور فلسفہ کی جو بے نظیر خدمت کی ہے وہ ایشیائی اور سامی اقوام پر ان کی فضیلت ثابت
کرنے کے لیے کافی ہے۔ علوم و فنون اور فلسفہ میں اتنی دسترس انہیں محض اس لیے

حاصل ہوئی کہ ان کی رگوں میں آریائی خون دوڑ رہا تھا۔ ہرٹز اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ارسطو علوم وفنون کے میدان میں ایشیائیوں کی استعدادوں کا کمال درجہ معترف تھا اور برملا کہتا تھا کہ صنعت وحرفت اور سیاست میں یورپ کی شمالی اقوام بالکل تہی دست ہیں۔ ہرٹز نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک یونانی مورخ توسیدید کے قول کے بموجب یونان کافی عرصے تک بربروں کے زیر تسلط رہا ہے۔ ہیرودوت نے بھی لکھا ہے کہ اس نے یونان کے بعض علاقوں میں بربری زبان کے الفاظ سنے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یونانیوں پر بربریوں کا غلبہ واقتدار رہا ہے۔ وہاں کے بعض علاقوں اور شہروں کے نام بھی خالص یونانی نہیں ہیں۔ موجودہ زمانے کے بعض علماء اور مفکرین مثلاً کرشمر، کیسلیج اور نک وغیرہ نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایشیائے کوچک اور یونان کے باشندوں کی اصل ایک ہی ہے اور اہل یونان بھی دراصل ایشیائی ہی ہیں۔ تمام مورخین متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ یونانی فلسفہ کا موجد "طالیس" سامی الاصل تھا اور اس نے مصر میں تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح رواقی فلسفہ کا بانی "زینون" بھی نسلی لحاظ سے ایشیائی تھا۔ ویرث نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "ہومر" خود ایک سامی لفظ ہے جو "زمر" سے نکلا ہوا ہے جس کے معنی مغنی اور بنسری بجانے والے کے ہوتے ہیں۔

ہرٹز نے لکھا ہے کہ قومی اور نسلی اختلاف دو قوموں کے افراد کو یکجا ہونے سے نہیں روک سکتا اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بعض اقوام نے پس ماندہ اقوام

کے افراد کو ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر اپنے ساتھ ملانے اور انھیں اپنے ہاں اعلیٰ عہدے دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ چنانچہ "ہنی بال" کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ حبشی النسل تھا لیکن اپنی ذکاوت و فطانت، اور اعلیٰ جنگی صلاحیتوں کے باعث جرنیل کے عہدے پر فائز ہوا۔ اور ایک معزز یورپی خاندان میں اس کی شادی ہوئی۔ اسی طرح اس کے پوتے "پوشکین" کا شمار دنیا کے بڑے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ہیمبرگ (جرمنی) کے ایک تاجر نے سلطان زنجبار کی لڑکی سے شادی کی۔ وہ لڑکی اس قدر ذہین و فطین اور ہوشیار تھی۔ کہ پورے جرمنی میں اس کا ثانی نہ تھا۔ اس کی بے نظیر ذہانت فطانت کا شہرہ سن کر ملکہ فریڈرک نے اسے اپنی مصاحبت میں لے لیا اور وہ ملکہ کی گہری سہیلی بن گئی۔ ملکہ کی فرمائش پر اس نے "ایک عربی شہزادی کی داستان" کے نام سے اپنی زندگی کے حالات بھی تحریر کئے یہ تو چند مثالیں ہیں جو ہم نے تحریر کی ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ یورپ کے متعدد معزز خاندانوں اور افراد کی رگوں میں حبشی اور غیر یورپی خون دوڑ رہا ہے۔

ہرٹز لکھتا ہے کہ یہ امر تعجب انگیز ہے کہ بنی نوع انسان میں اتنی اسے اختلاف پر منافرت اور عصبیت کے گہرے پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ رنگ و نسل کا معمولی اختلاف اس امر کا ثبوت نہیں ہوتا کہ فلاں قوم یقیناً اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل اور معزز کہلانے کی مستحق ہے اور فلاں نسل ان اعلیٰ صلاحیتوں سے محروم ہے۔ لہٰذا اس کا شمار ادنیٰ اقوام میں کرنا چاہئے۔ خدا نے ہر قوم اور نسل کو ہر قسم کی صلاحیتوں

سے نوازا ہے۔ لہذا رنگ و نسل کے اختلاف پر اپنے آپ کو معزز سمجھنا اور دوسرے کو حقیر و ذلیل خیال کرنا کسی صورت میں روا نہیں۔

مندرجہ بالا بیانات اور دلائل کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخی وقائع، علمی مباحث اور چشم دید واقعات غرضیکہ کسی جہت سے بھی نسلی تفوق کے ان داعیوں کی تائید نہیں ہوتی جو اپنے آپ کو دنیا کی تمام اقوام میں سب سے زیادہ معزز اور افضل و برتر سمجھتے۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر قسم کی خوبیاں اور اعلیٰ صلاحیتیں صرف انہی کی قوم سے مخصوص ہیں اور دیگر اقوام اس شرف سے محروم۔

تاہم ان تمام حقائق کے باوجود ایک امر ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ اگرچہ دنیا کی کسی خاص قوم کو علم پر اجارہ داری حاصل نہیں جیسا کہ یورپ کے بعض انتہا پسند عناصر کا خیال ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قوموں اور نسلوں کے درمیان طبائع اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم اور نسل موروثی اور طبعی طور پر بعض خصوصیات اور عادات و اطوار کی حامل بھی ہوتی ہے اور یہ خصوصیات اور عادات و اطوار اس قوم کے افراد کے ذہنوں پر چھایا ہوا اثر بھی ضرور ڈالتی ہیں۔ تاہم ان موروثی صفات کا اثر بعض افراد کے ذہنوں پر زیادہ ہوتا ہے اور بعض کے ذہنوں پر کم۔ اس طرح گو ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک قوم کے افراد میں۔ فرق یقیناً ہوتا ہے تاہم قومی اور نسلی خصوصیات سے ہر ایک کو کم و بیش حصہ ضرور ملتا ہے

تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ قوم کے افراد میں نسلی اور قومی خصوصیات کافی لمبے عرصے تک برقرار رہتی ہیں۔ بالخصوص ایسی قوموں میں جہاں شادی بیاہ کا سلسلہ اپنے ہی قبیلے اور وطن کے افراد تک محدود ہو۔ دوسری قوموں کے عادات و خصائل کا تو کتاب میں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں لیکن چونکہ سیاہ فام اقوام اس جگہ ہمارا خاص موضوع ہیں۔ اس لئے ان کے بعض اوصاف و خصائل کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سائیس DR. SYCE اپنی کتاب "عہد قدیم کی اقوام" میں حبشیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"حبشیوں کا چہرہ لمبا، ٹھوڑی پتلی، جبڑے بڑے، ناک چپٹی، نتھنے خوب پھولے ہوئے۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ دانت بڑے بڑے۔ سر کے بال گھنگھریالے اور بازو لمبے ہوتے ہیں۔ موسیقی کے سوا دیگر فنون میں انہیں بالعموم دسترس نہیں ہوتی۔ ان کی طبائع بہت حساس اور جذباتی ہوتی ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ لیکن گہرے غور و فکر کی طرف ان کی طبائع مائل نہیں ہوتیں۔ ان پر سستی بہت غالب رہتی ہے۔ وہ بہت نرم دل ہوتے ہیں۔ وفاداری ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ اسی لئے انہیں عہد قدیم سے غلام بنانے کا رواج چلا آرہا ہے مصر کے فراعنہ تو غلاموں کو پکڑنے کے لئے بعض خصوصی مہمیں حبشہ روانہ کرتے تھے۔ حبشیوں میں تقلید کا مادہ بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

حبشی بڑے بہادر اور دلیر ہوتے ہیں۔ نہ موت سے ڈرتے ہیں نہ شدائد و مصائب
سے گھبراتے ہیں۔ ازمنۂ ماضیہ میں ان کی پیٹھوں پہ کوڑے پڑتے تھے اور ان کی پھٹی
ہوئی کھال سے خون جاری ہوتا تھا لیکن وہ نہایت صبر و استقلال سے یہ تمام مصائب
و آلام برداشت کرتے تھے اور زبان سے کوئی لفظ ایسا نہ نکالتے تھے۔ جس سے
بے چینی کا اظہار ہوتا ہو۔ ان کے ظالم آقا ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے
تھے اور قسم قسم کے عذابوں میں انھیں مبتلا رکھتے تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں بھاگ
جانے کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ درد و تکلیف کی وجہ سے راہِ فرار اختیار کرنے
کو وہ اپنے لئے اسی طرح عار خیال کرتے تھے۔ جس طرح شجاع اور جوان مرد
انسان میدانِ وغا میں پیٹھ دکھانے کو اپنے لئے موجبِ ننگ سمجھتا ہے۔ ان کی
وفاداری ضرب المثل ہے اور وہ نہایت خلوص سے اپنے آقاؤں کی خدمت کرتے
ہیں۔ اگر کوئی آقا ان سے نرمی اور شفقت و محبت کا سلوک کرے تو وہ اس کی راہ
میں جانیں تک قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی وہ ناقابلِ
برداشت مظالم کی تاب نہ لا کر بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ تب اپنے ظالم آقاؤں
کے خلاف دشمنی اور نفرت و حقارت کا بے پناہ جذبہ ان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے
کیونکہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ دوبارہ اپنے سنگدل آقاؤں کے ہتھے چڑھ گئے
تو انھیں پہلے سے بھی کہیں زیادہ دردناک عذابوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا
وہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مقولہ کے مطابق ہر قیمت پر اپنی آزادی کی حفاظت

کرتے ہیں اور سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آقاؤں کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں اور یہ پروا نہیں کرتے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

بادی النظر میں سیاہ فام اقوام تہذیب و تمدن سے عاری، علوم و فنون سے کوری اور صنعت و حرفت سے بیگانہ نظر آتی ہیں۔ نہ انھیں علوم ہندسہ کی خبر ہے نہ علوم فلکیات کی۔ نہ طبیعیات سے آگہی ہے اور نہ کیمیا سے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں سرے سے علوم و فنون سیکھنے اور صنعت و حرفت کے میدان میں قدم مارنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم سے امتیازی سلوک نہیں برتا اور سب کو ایک جیسی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اگر انھیں ان علوم میں دسترس حاصل نہیں ہے تو اس کی وجہ محض صرف یہ ہے کہ انھیں ان طبعی حالات سے واسطہ نہیں پڑا۔ جو ان علوم کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوتے ہیں۔ سفید فام اور گندم گون اقوام کے مقابلے میں اگر سیاہ فام اقوام علم فلکیات میں ہیچ نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں وسیع سمندروں میں لمبے لمبے سفر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر انھیں علم ہندسہ میں دسترس حاصل نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عالی شان عمارتیں اور فلک بوس محلات نہیں بنائے جاتے بلکہ وہ کچے پکے مکانوں اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں رہ کر زندگی گزار لیتے ہیں۔ اگر انھیں فنون جنگ سے کماحقہٗ واقفیت نہیں ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں

اس طرح وسیع پیمانے پر جنگیں نہیں ہوتیں جس طرح متمدن و مہذب قوموں کے درمیان ہوتی ہیں۔ یہی حال دیگر علوم و فنون کا ہے۔ چونکہ انھیں ان سے کام نہیں پڑتا اس لیے وہ انھیں سیکھنے یا ان میں کمال حاصل کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرتیں۔ ان کی طرزِ معاشرت بہت سادہ ہے اور زندگی بسر کرنے کے لئے انھیں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ انھیں بغیر کسی جدوجہد کے بآسانی مہیا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے جدید علوم کے سیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ استعماری طاقتوں نے ان پر غلبہ پا کر انھیں اس درجہ پستی کی حالت میں رکھا ہوا ہے کہ ان میں ابھرنے اور دیگر اقوام عالم کے دوش بدوش ترقی کی راہوں پر قدم مارنے کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جن قوموں نے علوم ہندسہ، فلکیات، طبعیات اور کیمیا وغیرہ میں ترقی کی ہے اور صنعت و حرفت کی راہوں پر قدم مارا ہے وہ سب ایسی ہیں جو سادہ زندگی بسر کرنے کی خوگر ہی نہیں۔ اگر ان کے طبعی اور معاشرتی حالات بھی ویسے ہی ہوتے جیسے براعظم افریقہ میں رہنے والے لوگوں کے ہیں تو یقیناً انھیں بھی علوم و فنون میں کوئی دسترس حاصل نہ ہوتی۔ اور وہ بھی صنعت و حرفت میں ایسے ہی کورے ہوتے جیسے افریقی ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں بھی شک نہیں کہ اگر افریقی اپنی اجتماعی زندگی کے طور طریقے بدل لیں اور اسی طرزِ معیشت کو اختیار کر لیں جو متمدن اقوام کا خاصہ ہے تو یقیناً کچھ عرصے کے بعد وہ بھی علوم و فنون اور صنعت و حرفت کے میدان میں مندرجہ بالا اقوام کے ہم پلہ ہو جائیں گے اور فہم و ادراک میں بھی ان کا وہی پایہ

ہو گا جو دیگر اقوام کا ہے۔

جہاں تک طب اور علم جراحی وغیرہ کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید علوم سے بہرہ ور نہ ہونے کی صورت میں وہ متمدن اقوام کے ہم پایہ تو نہیں ہو سکتے۔ تاہم ان علوم میں عام حالات میں جس قدر مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں ضرور پائی جاتی ہے۔ جڑی بوٹیوں کے خواص کا علم رکھنے میں بھی وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

البتہ ادبیات میں انھوں نے جو سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ واقعی حیرت انگیز ہے انتہائی پسماندگی کی حالت کے باوجود انھوں نے گلستانِ شعر و ادب میں جس قسم کی بہار آفرینی کی ہے۔ اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اگر انھیں دیگر شعبہ ہائے حیات میں بھی قدم بڑھانے کا موقع ملتا تو وہ اپنی صلاحیتوں کو وہاں بھی بہترین طور پر استعمال کرتے عنترہ اور سحیم کے قصائد عربی ادب کے بہترین نمونے ہیں اور ان سے حبشی غلاموں کی قادر الکلامی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

یہ امر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دنیا نے حبشی اقوام سے کسی بھی دور میں نرمی اور انصاف کا سلوک نہیں کیا۔ قدیم زمانے میں غلاموں کی تجارت کرنے والے انھیں بحیرہ احمر۔ بحر ہند اور دریائے نیل کے ذریعے عرب، عراق، شام، فلسطین، مصر یونان اور روم لے جاتے تھے اور وہاں کے بازاروں میں انھیں فروخت کر دیتے

کر دیتے تھے۔ نئی دُنیا دریافت ہونے پر جب یورپ کے لوگوں نے امریکہ کا رُخ کیا اور وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کرنی شروع کیں تو وہ اپنی مدد کے لیے حبشی غلاموں کو بھی ساتھ لے جانے لگے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے مالکوں کی خدمت جفاکشی اور تندہی سے کرتے تھے۔ اس لیے ان کی مانگ وہاں بہت زیادہ بڑھ گئی اور غلاموں کی تجارت کا رُخ پُرانی دُنیا سے نئی دُنیا کی طرف ہو گیا۔ لاکھوں غلام افریقہ سے پکڑ پکڑ کر امریکہ پہنچا دیئے گئے۔ اس طرح وفاداری اور جفاکشی کی صفاتِ حسنہ ان مظلوم لوگوں کے لیے راحت و آرام کی بجائے دائمی مصیبت کا موجب بن گئیں۔ امریکہ دریافت ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک اہلِ یورپ وہاں کے اصلی باشندوں (ریڈ انڈینز) کو پکڑ کر اس امید میں یورپ لاتے رہے کہ وہ بھی افریقیوں کی طرح محنت و جانفشانی سے ان کی خدمت کریں گے۔ لیکن ان کی یہ اُمید عبث ثابت ہوئی اور ریڈ انڈینز انھیں راحت و آرام پہنچانے کی بجائے اُلٹا ان پر بوجھ ثابت ہونے لگے۔ لہٰذا مجبور ہو کر اُنھوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔

دُنیا متعدد ادوار سے گزرتی گئی حتّیٰ کہ وہ دور آ گیا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ اس دوران میں متعدد تحریکات انسانی حقوق کی بحالی کا مطالبہ لے کر کھڑی ہوئیں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں دو ہولناک عالمگیر جنگیں بھی کرۂ ارض پر برپا ہوئیں جن کے دوران میں بار بار مساواتِ انسانی کا نعرہ بلند کیا گیا لیکن بلند بانگ دعاوی کے باوجود انسانیت ہنوز پستی ہی کی حالت میں ہے اور پس ماندہ اقوام ابھی تک

ظلم وستم کی چکی کے نیچے بری طرح پس رہی ہیں۔

۱۹۴۵ء میں برطانیہ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں متفقہ طور پر یہ قرار داد منظور کی گئی کہ برطانوی نوآبادیات اور مقبوضات میں ابیض و اسود کا امتیاز یکسر ختم کر دیا جائے اور مساوات انسانی کو پورے طور پر قائم کیا جائے۔ برطانوی کلیسا نے بھی اس قرار داد کی حمایت کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ جنگ کے دوران میں اتحادی طاقتوں نے امتیاز رنگ و نسل کو دور کرنے اور عالمی امن کو برقرار رکھنے کی خاطر اقوام عالم کو مساوی حیثیت دینے اور سب کو ایک ہی برادری میں شامل کرنے کے متعلق جو وعدے کئے تھے وہ انہیں پورا کریں گی۔

دوران جنگ میں مساوات انسانی کا علم بلند کرنے اور مجلس اقوام متحدہ کے قیام کی کوششوں میں امریکہ پیش پیش تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہاں ابھی تک نسلی امتیاز شدت سے موجود ہے۔ جنوبی ریاستوں میں تو یہ امتیاز قانونی طور پر موجود ہے۔ وہاں کالوں کو بسوں، ٹرینوں، ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں گوروں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح ان کے بچوں کو گورے بچوں کے سکولوں میں تعلیم پانے کی ممانعت ہے۔ بہت لے دے کے بعد یہ قانون پاس ہوا کہ کالے بچوں کے لئے بھی گورے بچوں کی طرح تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ البتہ ان کے سکول گورے بچوں کے سکولوں سے علیحدہ قائم کئے جائیں۔ لیکن اس قانون کے معرض وجود میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ تعلیمی مساوات بھی محض ایک ڈھونگ ہے

کیونکہ تعلیمی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوب کی نو ریاستوں میں حکومت گورے لڑکوں کی تعلیم پر بچپن ڈالر فی کس سالانہ خرچ کرتی ہے جبکہ قانون میں صراحت کے باوجود کالے لڑکوں کے لئے صرف انیس ڈالر فی کس سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں مسیسپی کی ریاست میں تو یہ تناسب اور بھی کم ہے۔ وہاں گورے لڑکوں کی تعلیم پر باون ڈالر فی کس سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں۔ لیکن کالے طالب علموں پر صرف ساڑھے سات ڈالر سالانہ۔

شمالی ریاستوں میں قانونی طور پر تو بے شک گورے اور کالے کا امتیاز ختم کر دیا گیا ہے۔ لیکن عملی طور پر یہ امتیاز ہنوز برقرار ہے۔ وہاں بھی بڑے بڑے ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں کوئی حبشی داخل نہیں ہو سکتا خواہ وہ کتنا ہی امیر کبیر کیوں نہ ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب مساوات اور انصاف کے تمام تر دعووں کے باوجود نسلی امتیاز کے مسئلے کو حل کرنے میں سراسر ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ کیونکہ جہاں گوناگوں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مصلحتیں راہ میں حائل ہو جاتی ہوں وہاں ایک خالص انسانی مسئلے کو حل کرنے کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے دنیا کے اس قدیم ترین مسئلے کو ہزارہا رکاوٹوں اور معاشرتی و اقتصادی مصلحتوں کے باوجود آن واحد میں حل کر دیا اور اس طرح

دنیا میں پہلی بار مساوات انسانی اور حقیقی عدل و انصاف کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ دنیا کی تمام تہذیبوں اور نظاموں پر اسلام کی برتری کا یہ ایسا واضح ثبوت ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ جس پیچیدہ اور مشکل ترین مسئلے کو حل کرنے میں تمام مادی نظام ناکام ثابت ہوئے وہاں اسلام کا روحانی نظام سراسر کامیاب رہا۔

تاہم اس سلسلے میں ایک امر ضرور ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ کوئی دین اس وقت تک حقیقی طور پر دین کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک ایک عظیم روحانی شخصیت اس کی اشاعت کرنے، اسے افراط و تفریط کی راہوں سے بچانے اور لوگوں کی ذاتی مصلحتوں اور نفسانی خواہشات سے الگ رکھنے کے لیے موجود نہ ہو۔ دین اسلام کو یہ عظیم روحانی شخصیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی شکل میں ملی۔ آپ کی مقناطیسی شخصیت کا اثر تھا کہ اسلام کے آغاز ہی میں جہاں ایک طرف بلال ؓ بن رباح جیسے غریب اور کمزور اشخاص نے آپ کی دعوت پر دل و جان سے لبیک کہا جو اس وقت مکہ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہاں دوسری طرف ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ جیسے لوگ بھی کشاں کشاں اس طرف کھنچے چلے آئے جن کا شمار مکہ کے سربرآوردہ اور معزز اشخاص میں ہوتا تھا۔

ہم یہ کتاب حضرت بلالؓ کی سیرت کے بارے میں تحریر کر رہے ہیں چونکہ ان کا

تعلق افریقہ کی سیاہ فام اقوام سے تھا، اس لئے آغاز کتاب میں ان اقوام کے حالات
کا ذکر کر دینا اور اسی مناسبت سے نسلی امتیاز کے مسئلے پر بحث کرنا مناسب معلوم
ہوا۔

حضرت بلالؓ کے متعلق یہ خیال کرنا درست نہیں کہ وہ خالص حبشی تھے۔ وہ سیاہ فام
نسل سے ضرور تعلق رکھتے تھے اور اس کی بعض خصوصیات سے بھی انھوں نے
حصہ وافر پایا تھا۔ مثلاً عزم و استقلال۔ جفاکشی۔ مصائب و آلام پر برداشت کی طاقت
اپنے ظالم آقاؤں سے کمال درجہ نفرت اور محسنوں سے انتہائی وفاداری۔ لیکن اسی
کے ساتھ حبشیوں کی بعض مخصوص علامات ان میں مفقود تھیں۔ مثلاً ان کی ناک چپٹی نہ
تھی۔ ہونٹ موٹے نہ تھے اور نہ ہی بال گھنگھریالے تھے۔

ماہرین علم الاقوام کا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں بعض سامی یا عربی قبیلے افریقہ میں
جا کر آباد ہو گئے تھے اور وہاں انھوں نے مقامی باشندوں سے سلسلۂ ازدواج
بھی قائم کر لیا تھا جس کے باعث ان کی نسلوں کے رنگ تو افریقہ کی دوسری اقوام کی
طرح کالے پڑ گئے لیکن حبشیوں کی خاص علامات ان میں ظاہر نہ ہوئیں۔ بعد میں ان
سے بعض لوگ غلام بن کر عرب میں واپس آ گئے۔ چونکہ ان کے رنگ سیاہ تھے۔
اس لئے عرب انھیں حبشی ہی سمجھتے تھے۔

یہ توجیہہ بہت حد تک قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ عرب قدیم زمانے سے
جہازوں میں سوار ہو کر مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں تجارت کے لئے جایا کرتے

تھے۔ بالخصوص اہل یمن کا تو اہل حبشہ سے بہت زیادہ تعلق تھا۔ کیونکہ یمن حبشہ سے بہت نزدیک واقع ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ عربوں کا کوئی قبیلہ جو تجارت کی غرض سے مشرقی افریقہ گیا ہو وہاں ہی آباد ہو گیا ہو اور اس کی اولاد غلام بن کر واپس عرب آئی ہو۔

مورخین نے حضرت بلال ؓ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مکہ یا یمن کے مولدین میں سے تھے۔ یعنی ان کی والدہ تو حبشیہ تھیں۔ لیکن والد سر زمین عرب ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے نزدیک ان کے بارے میں یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہو گا کہ وہ "حبشی۔ سامی نسل" سے تعلق رکھتے تھے اور اسی لئے ان کے اخلاق و عادات حبشیوں کی نسبت عربوں کے زیادہ مشابہ تھے۔

عرب اور نسلی امتیاز

گزشتہ باب میں ہم نے نسلی امتیاز کے متعلق بعض علماء و فضلاء کے خیالات کا ذکر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں چند امور کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ بسا اوقات قوموں اور افراد میں نسلی اور قومی غرور تو موجود ہوتا ہے لیکن اس کے باعث وہ دوسری اقوام سے حقارت اور نفرت کا سلوک نہیں کرتے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اقوام محض اختلافِ نسل کی بنا پر دوسری اقوام سے معاندانہ سلوک روا رکھتی ہیں۔ تاہم خود ان میں کوئی ایسی خوبی موجود نہیں ہوتی جس کی بنا پر دوسروں کے سامنے بجا طور پر فخر و مباہات اور نسلی غرور کا اظہار کر سکیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مختلف اقوام صدیوں سے ایک دوسرے کے دوش بدوش زندگی گزارتی چلی آتی ہیں لیکن ان کے درمیان جذبۂ منافست پیدا

نہیں ہوتا۔ عربوں کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے ایک طرف شام کی بازنطینی سلطنت تھی۔ دوسری طرف ایرانیوں کی ساسانی سلطنت۔ تیسری طرف حبشہ کی عیسائی سلطنت لیکن ان تینوں سلطنتوں سے عربوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔ ان سلطنتوں کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی اور وہاں کے باشندے زندگی کی آسائشوں اور نعمتوں سے پوری طرح بہرہ مند تھے۔ ان کے مقابلے میں عرب بے چارے مفلس اور غریب تھے۔ لے دے کر ان کے پاس قابل فخر چیز اگر کوئی تھی تو ان کی زبان اور عالی نسبی تھی۔ فصاحت و بلاغت اور طلاقت لسانی میں عربوں کا جواب نہ تھا اور حسب و نسب کے لحاظ سے ان کا سلسلہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا تھا۔ لیکن ان کی ہمسایہ اقوام اس شرف سے محروم تھیں۔ نہ وہ فصاحت و بلاغت میں عربوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں اور نہ عالی نسبی میں ان کا عربوں سے کوئی جوڑ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عرب اپنی فصاحت و بلاغت اور عالی نسبی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے ساتھ ساتھ ہمسایہ اقوام کو عجمی (گونگے) اور مخلوط النسل کہہ کر اپنے جذبہ پندار کو تسکین دیتے رہتے تھے۔

تاہم اپنے آپ کو دوسری اقوام کے مقابلے میں برتر خیال کرنے کے باوجود میں ان کے خلاف وہ جذبہ عداوت موجود نہ تھا جو آج کل امریکہ میں گوری نسل کے لوگوں اور وہاں کے اصلی باشندوں (ریڈ انڈینز) کے درمیان، جنوبی افریقہ میں، یورپینوں اور رنگ دار نسل کے درمیان اور آسٹریلیا میں انگریزوں اور مقامی باشندوں

کے درمیان نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ عرب بالعموم اپنے غلاموں سے حقارت کا سلوک کرتے تھے مگر اس تحقیر و تذلیل کا تعلق نسلی امتیاز کے مسئلے سے نہ تھا۔ عرب غلاموں سے حقارت کا سلوک اختلاف رنگ و نسل کی بنا پر نہ کرتے تھے۔ خود عربوں کے بعض قبائل سیاہ فام تھے اور ان کے بعض سرداروں کے متعلق تو مشہور ہے کہ شکل و شباہت اور رنگ کے لحاظ سے ان میں اور حبشیوں میں چنداں فرق نہ تھا۔ پس محض حبشی ہونے کی بنا پر غلاموں سے حقارت کا سلوک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ عرب میں ہر غلام حبشی ہوتا تھا۔ عرب کے بازاروں میں حبشیوں کے علاوہ غیر حبشی غلاموں کی تجارت بھی ہوتی تھی اور عرب قبائل غارت گری کے وقت حبشیوں اور غیر حبشیوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔ غلاموں سے برا سلوک اس لئے نہ ہوتا تھا کہ وہ سیاہ فام تھے یا کسی ایسی قوم سے تعلق رکھتے تھے جو عربوں کی دشمن تھی۔ غلاموں سے نفرت و حقارت کی وجوہ معاشرتی تھیں۔ نسلی اختلاف کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

عرب میں ایک زمانہ ضرور ایسا آیا ہے جب افریقہ سے حبشی قبائل کثرت سے سرزمین عرب میں وارد ہونے لگے اور ان کی بیشتر تعداد بصرہ میں آباد ہو گئی۔ اس وقت عربوں اور ان حبشیوں میں واقعی ایسی دشمنی پیدا ہو گئی تھی جیسی آج کل مختلف اقوام میں نظر آتی ہے۔ لیکن یہ عارضی چیز تھی اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یہ دشمنی بھی جاتی رہی۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہر سیاہ فام غلام کے متعلق جس کا ذکر روایاتِ عرب میں آیا ہو۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ضرور حبشی تھا بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی سامی خاندان افریقہ میں جا کر آباد ہو گیا اور پھر اس کا کوئی فرد غلام بن کر عرب میں آ گیا۔ رنگ تو اس کا یقیناً سیاہ ہوتا تھا لیکن حبشیوں کی دوسری علامات اس میں مفقود ہوتی تھیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ حضرت بلالؓ بن رباح بھی ــــ جن کی سیرت کے متعلق یہ کتاب تحریر کی جا رہی ہے ــــ خالص حبشی نہ تھے کیونکہ عربی مورخین کی تاریخوں سے ہمیں ان کے سیاہ فام ہونے کا تو پتا چلتا ہے لیکن یہ ذکر کہیں نہیں ملتا کہ ان کی ناک چپٹی اور بال گھنگھریالے تھے۔ حالانکہ حبشی کی پہچان ہی یہی ہے کہ رنگت کی سیاہی کے ساتھ ساتھ اس کی ناک چپٹی اور بال گھنگھریالے ہوں۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی حضرت بلالؓ پر ہر قسم کی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ اور حضرت بلالؓ پر ہی منحصر نہیں، اس زمانے میں تمام غلاموں کا یکساں حال تھا۔ انہیں جانوروں سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا اور ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے تھے محض اس لئے کہ وہ ایک بے کس اور بے سہارا مخلوق تھی اور ان کی حمایت کرنے اور ان پر ترس کھانے والا کوئی نہ تھا۔ عین اس وقت سرزمین عرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔ داعیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے واشگاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ اسلام عربی اور عجمی آزاد اور غلام اور گورے اور

کالے میں کسی تفریق کا قائل نہیں بلکہ وہ معاشرے کے تمام طبقات میں کامل مساوات کا علم بردار ہے۔ عرب کی یہ بے کس ترین مخلوق کسی ایسی ہی آواز کے انتظار میں تھی جونہی مکہ کی گلیوں میں توحید کی ندا بلند ہوئی۔ غلاموں نے بڑھ چڑھ کر اس پر لبیک کہا۔ انہی میں حضرت بلالؓ بن رباح بھی تھے جو ان خوش قسمت لوگوں میں شامل تھے جنھیں بارگاہ خداوندی سے "السابقون الاولون" کا خطاب عطا ہوا تھا اور جنھیں اس وقت اسلام قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی جب مکہ کا بچہ بچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن بنا ہوا تھا اور وہ صنادید قریش جن کی عقل و خرد کی سارے عرب میں دھوم تھی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بدترین مخالف بن کر اسلام کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے درپے تھے۔

اسلام اور غلامی

حریت اور مساوات کا صحیح احساس اس وقت تک ذہنِ انسانی میں جاگزین نہیں ہو سکتا جب تک اس میں روحانیت پیدا نہ ہو۔ دوسری احساس کی طرح انسانی خرید و فروخت انسانیت کے ماتھے پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے روحانیت سے علاقہ رکھنے والا کوئی شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ ایمانیات کی رو سے تو تمام انسان برابر ہیں بلکہ نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے شخص کو دوسروں پر ہر لحاظ سے فضیلت اور فوقیت حاصل ہوتی ہے خواہ وہ کتنا ہی غریب اور مفلس کیوں نہ ہو۔

لیکن "روحانی ادیان" کا ظہور انسانی سوسائٹی میں غلامی کے معرضِ وجود میں آنے کے ہزاروں سال بعد ہوا۔ اس لمبے عرصے میں طبقاتی امتیازات اتنے شدید

ہو گئے کہ ان ادیان کے لئے ان کو یکسر ختم کرنا ناممکن ہو گیا۔ انسانی عواطف و جذبات اتنے سرد تھے۔ کہ ان پر اس بے کس اور بے بس طبقے کی مظلومی کا کوئی اثر نہ تھا۔ غلاموں پر بھی بے حسی طاری تھی اور انھیں اپنی ذلت اور مظلومیت کا کوئی احساس نہ تھا۔ اگر کسی میں یہ احساس پیدا بھی ہوتا تھا تو اس میں اپنے جابر و ظالم آقاؤں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی جرأت اور ہمت نہ تھی۔ ان حالات میں روحانی مصلحین کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ غلامی کو مٹانے کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھاتے تاہم ان کے پاس اس انسانیت سوز رواج کے جواز کی بھی کوئی دلیل موجود نہ تھی۔ اس مشکل سے عہدہ برا ہونے کے لئے انھوں نے یہ فلسفہ ایجاد کیا کہ اس مادی دنیا میں اگر کوئی انسان دوسروں کی غلامی میں زندگی بسر کرتا اور مظالم اور آفات کا نشانہ بنتا ہے تو اسے رنج و غم اور افسوس کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کے دربار میں سب انسان ایک سطح پر ہوں گے اور آخرت میں آقائی اور غلامی کا فرق دور ہو جائے گا۔ بلکہ اعمالِ صالحہ بجا لانے کی صورت میں غلام کا درجہ آقا سے کہیں بلند ہو گا اور وہ آقا سے بہت زیادہ نعماءِ الٰہی حاصل کر سکے گا۔

اسی فلسفے کے زیرِ اثر مقدس پولوس نے اپنے ایک خط میں جو "اہل افسس" کے نام تھا، غلاموں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کے اسی طرح فرماں بردار رہیں جس طرح وہ مسیح کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ پطرس حواری نے بھی غلاموں کو اپنے آقاؤں کی فرمانبرداری کرنے کی اتنی شدت سے تاکید کی تھی کہ معلوم ہوتا تھا

یہ بھی احکام دین میں سے ایک ضروری حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسائی نظام میں غلامی سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور فلاسفر اور ارسطو کے ایک مقلد تھامس اکوینی نے سیاست کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں اس نے مسیحی رسولوں کے علاوہ ارسطو کے اقوال سے بھی غلامی کی اباحت کے بارے میں استناد کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ارسطو کے نزدیک نظام عالم کو بہتر طور پر چلانے کے لئے غلامی کا وجود ضروری تھا۔

سب سے تعجب انگیز بات یہ ہے کہ وہ ملک جہاں حیوانات کو ذبح کرنا تو درکنار انھیں معمولی تکلیف پہنچانا بھی مہاپاپ خیال کیا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ غلاموں اور پست اقوام کے معاملے میں انتہائی سنگ دل واقع ہوئے ہیں۔ اس کی روشن مثال ہمیں ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو ہندو گائے کی تعظیم میں کسی قسم کا دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ دوسری طرف شودروں سے جن کی زندگی غلاموں سے بھی بدتر ہوتی ہے، اس قدر ذلت کا سلوک کرتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

تاہم تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے نتیجے میں اتنی بات ضرور پیدا ہو گئی کہ بعض متمدن ممالک میں لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ وہ انسانیت سوز سلوک ختم ہو گیا جو دور وحشت میں ان پر روا رکھا جاتا تھا اور انھیں بھی بعض حقوق و مراعات سے نوازا جانے لگا۔ چنانچہ قدیم مصری اپنی لونڈیوں کے ساتھ بہت حد تک بیویوں جیسا

سلوک کرتے تھے اور اگر کوئی شخص بغیر کسی وجہ کے کسی غلام کو قتل کر دیتا تھا تو قصاص میں اسے بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔

مصریوں کے طرز عمل کو دیکھ کر عبرانیوں نے بھی غلاموں اور نوکروں چاکروں پر سختی موقوف کر دی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کثیر التعداد عبرانی مصر میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے اور انھیں وہ تمام سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں جو مزدور پیشہ لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ اس طرح انھیں غلاموں کی مظلومیت کا بخوبی احساس تھا اور اسی لئے وہ بالطبع غلاموں اور نچلے طبقے کے لوگوں پر مہربان تھے اور ان کے درد کو اپنا درد اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے۔

اہل فارس کا دستور تھا کہ وہ پہلی غلطی پر غلام کو سزا نہ دیتے تھے۔ البتہ اگر غلام سے پے در پے غلطیاں صادر ہونے لگتیں۔ تب آقا کو سخت سے سخت سزا دینے کا اختیار تھا۔ یہی کہ وہ اسے سنگین جرم کی پاداش میں قتل بھی کر سکتا تھا۔ غلاموں سے حسن سلوک کرنے میں اہل ایران یونانیوں اور رومیوں سے زیادہ فراخ دل تھے۔ وہ ان سے بالعموم بہت شفقت و محبت کا سلوک کرتے تھے اور ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیتے تھے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ بالعموم اپنی لونڈیوں ہی کو بیویاں بنا لیتے تھے، دوسرے اہل ایران زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں رہائش رکھتے تھے جہاں روزی فراہم کرنے کے لئے دیہات کی نسبت زیادہ محنت و مشقت کرنے اور غلاموں پر سختی کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ غالباً انھوں نے اس

معلوم ملتے ہیں عبرانیوں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ کیونکہ یہود اور اہل فارس کافی عرصے تک ساتھ ساتھ رہے ہیں اور انھوں نے ایک دوسرے کے عادات و اطوار اور اخلاق و عادات سے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔

شمالی یورپ کی اقوام اس امر پر فخر کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کے ہاں کسی زمانے میں بھی غلامی کا رواج نہیں رہا۔ لیکن ان کا یہ فخر بے جا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان اقوام میں غلامی کا رواج نہ تھا لیکن اس کی وجہ ان اقوام کی اخلاقی برتری، رحم دلی اور انسانیت دوستی نہ تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ یورپ کے طبعی حالات ایسے ہیں کہ وہاں غلاموں کا رکھنا کثیر اخراجات کو چاہتا ہے جس کے اہل یورپ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہاں محض حالات کی مجبوری کی وجہ سے غلامی کا وجود نہ پایا جاتا تھا۔ اس میں ان کی شرافت کو کوئی دخل نہ تھا۔ ورنہ آج کل امریکہ اور افریقہ میں غلاموں اور رنگ دار اقوام کے ساتھ جو وحشیانہ اور انسانیت سے گرا ہوا سلوک ہو رہا ہے اور انھیں جس طرح تمام حقوق انسانی سے محروم کیا جاتا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اٹھارویں صدی تک تو یورپی اقوام کی نوآبادیوں میں یہ قانون بھی رائج تھا کہ غلام کے بھاگ جانے یا اپنے مالک سے درشت کلامی سے پیش آنے پر اسے قتل کی سزا بھی دی جا سکتی تھی لیکن اگر مالک اپنے غلام کو قتل کر دیتا تھا تو اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اقوام و ملل کے ہاتھوں غلاموں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اس کی مختصر کیفیت سطور مندرجہ بالا میں بیان کی جا چکی ہے۔ اب ہم

اسلامی تعلیمات کی رُو سے مسئلہ غلامی کا جائزہ لیتے ہیں

ظہور اسلام کے وقت معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے مسئلہ غلامی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی اور غلاموں کے حقوق و فرائض کی تعیین کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا چہ جائیکہ معاشرے میں نمایاں مرتبہ دلانے اور قید غلامی سے چھڑا کر دیگر آزاد انسانوں کی صف میں کھڑا کرنے کا سوال پیدا ہوتا۔ غلاموں پر بھی کامل بے حسی طاری تھی اور انھوں نے سچے دل سے یہ سمجھ لیا تھا کہ انھیں لوگوں کی خدمت کرنے، محنت و مشقت برداشت کرنے اور ہر طرح کی ذلت و رسوائی سہنے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے اور ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ماریں کھائیں، گالیاں سنیں، مظالم سہیں مگر اف نہ کریں۔ ان حالات میں جبکہ غلاموں کو دوسرے آزاد انسانوں کی سطح پر لانے اور معاشرے کے تمام افراد میں کامل مساوات کا تصور بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا، اگر اسلام بھی دیگر ادیان کی طرح اس مسئلے کے متعلق خاموشی اختیار کرتا اور اسلامی تعلیمات غلاموں کے ذکر سے خالی ہوتیں تو کسی جانب سے بھی اعتراض کی کوئی گنجائش نہ ہوتی اور نہ ہی اسلامی تحریک کو کسی طرح کا ضعف پہنچتا۔ مسلمانوں کی مالی اور اقتصادی حالت بھی اس وقت اس قدر خراب تھی کہ وہ بھاری زرِ فدیہ ادا کر کے مجبور و بے کس غلاموں کو ان کے کافر آقاؤں کے پنجوں سے آزاد نہ کرا سکتے تھے۔ لیکن اسلام نے تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر کے غلاموں کو معاشرے میں مساوی حقوق عطا کئے۔ ان کی آزادی کے لئے طرح طرح کی راہیں کھولیں اور

آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔

اسلام نے غلامی کے دروازے کو مسدود کرنے کے لئے جس حربے سے کام لیا۔ وہ مساواتِ انسانی کا حربہ تھا۔ اسلام نے نسلی امتیاز کو یک قلم موقوف کر کے فضیلت اور شرافت کا معیار صرف تقویٰ اور اطاعت خداوندی کو قرار دیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ جنت اس شخص کو ملے گی جو اللہ کی کامل اطاعت کرے گا۔ خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور دوزخ کا عذاب اس شخص کے حصے میں آئے گا جو اس کے احکام کی نافرمانی کرے گا خواہ وہ قریش کا معزز ترین فرد ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح اسلام نے اخوت اور مساواتِ انسانی کی ایسی تابندہ مثال قائم کر دی جس کی نظیر پیش کرنے سے زمانہ قاصر ہے۔

اسلام سے قبل غلامی کی مختلف صورتیں تھیں۔ بعض مرتبہ کسی قبیلے کے لوگ اپنے مخالف قبیلے پر اچانک دھاوا بول دیتے اور مال و اسباب لوٹنے کے علاوہ مرد و زن کو قید کر کے اپنے ہمراہ لے آتے۔ ان قیدیوں کو فاتح قبیلے کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا اور اس طرح ان بدقسمت انسانوں کے گلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طوقِ غلامی پڑ جاتا تھا۔ بعض مرتبہ راہزن کسی قافلے پر حملہ کر کے بچوں اور عورتوں کو پکڑ لیتے اور متمول افراد کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورتیں نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ تھیں اور اسلام، جو تمام عالم

کے لئے رحمت بن کر آیا تھا اور جو امن اور سلامتی کا داعی تھا۔ انھیں کسی صورت میں روا نہ رکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اُس نے ان تمام طریقوں کو ناجائز ٹھہرا کر آئندہ کے لیئے غلامی کا سلسلہ بند کر دیا۔ البتہ ایک صورت کو اُس نے بدرجہ مجبوری جائز رکھا اور وہ تھی میدانِ جنگ میں قیدی بنانے کا سلسلہ۔ لیکن اس کے ساتھ اُس نے ایسی شرائط لگا دیں۔ جن سے غلامی کا غیر محدود سلسلہ بے حد محدود ہو کر رہ گیا۔ اس بارے میں قرآن کریم نے مندرجہ ذیل احکام دیئے :۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ
فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا

(ترجمہ) نبی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بے گناہ لوگوں کو ناحق قیدی بنائے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں اور اُن کے دشمنوں کے درمیان خوں ریز جنگ برپا ہو اور جنگ کے نتیجے میں قیدی پکڑے جائیں۔ لیکن جب جنگ ختم ہو جائے اور فریق مخالف سے صلح کی بات چیت شروع ہو تو ان قیدیوں کو یا تو ازراہِ احسان چھوڑ دینا چاہیئے یا ان سے زرِ فدیہ لے کر انھیں رہا کر دینا چاہیئے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں :۔

(۱) غلامی کا سلسلہ آئندہ کے لئے بالکل ختم ہے اور مجبور و بے کس لوگوں کو جو لوٹ مار یا غارت گری کے نتیجے میں کسی گروہ کے ہتھے چڑھ گئے ہوں، سابق

کی طرح غلام تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) جنگ میں قیدی بنائے جا سکتے ہیں لیکن صرف ایسی جنگ میں جو کھلم کھلا ہو اور اس میں اچھی طرح خونریزی ہو چکی ہو۔ کسی حریف قبیلے پر اچانک چھاپہ مار کر نہتے لوگوں کو پکڑ لانا جائز نہ ہوگا۔ میدان جنگ میں پکڑے جانے والے قیدیوں سے بھی صرف اس وقت تک غلاموں کا سلوک کیا جاسکے گا۔ جب تک وہ زرفدیہ دے کر آزاد نہیں ہو جاتے

(۳) مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اگر ان کا اسیر غلام زر فدیہ دے کر رہائی حاصل کرنا چاہے تو وہ اس کے راستے میں روکاوٹ نہ ڈالیں بلکہ ہر طرح آسانی پیدا کر کے اسے زر فدیہ ادا کرنے کے قابل بنائیں اور اگر اس سلسلے میں انھیں کچھ مالی امداد بھی کرنی پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے علاوہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ . . . . .

(ترجمہ) اور تمھارے وہ غلام جو زرِ فدیہ دے کر رہائی حاصل کرنا چاہیں۔ اگر تمھیں یہ یقین ہو کہ وہ رہائی کے بعد تمھارے خلاف دوبارہ جنگ نہیں کریں گے اور مخالفانہ سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں گے تو تم ان کی پیش کش کو

قبول کر لو اور خود بھی اللہ تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تمھیں دیا ہے

ان کی مدد کرو۔

(۴) اگر مسلمان ازراہِ احسان انھیں زرِ فدیہ لئے بغیر رہا کر دیں تو یہ امر اللہ تعالیٰ

کی خوشنودی کا موجب ہوگا۔

اسلام کے ظہور پر صدیاں گزر چکیں۔ دنیا کے بیشتر علاقوں سے غلامی کا رواج

ختم ہو گیا۔ لیکن جنگی قیدیوں کے متعلق جو ضابطہ اسلام نے مقرر کیا تھا وہ علی حالہٖ

قائم ہے۔ آج تک کوئی جنگ ایسی نہیں گزری جس میں کثرت سے قیدی بنائے گئے ہوں۔

بڑی بڑی مہذب اقوام جنگوں میں قیدی بناتی ہیں نہ یہ کہ کوئی حرج نہیں سمجھتیں بلکہ ان کے نزدیک کوئی

فتح اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک دشمن کے سپاہیوں کی بھاری تعداد

ان کی قید میں نہ ہو۔ جنگ کے اختتام کے بعد یا تو مفتوح اقوام سے تاوان لے کر

قیدیوں کو چھوڑا جاتا ہے یا باہمی شرائط کے مطابق قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جاتا ہے

جو دراصل زرِ فدیہ ہی کے قائم مقام ہے۔ جب تک دنیا میں جنگوں کا سلسلہ جاری

ہے۔ مندرجہ بالا طریق عمل کے علاوہ عقل اور کوئی طریق عمل قبول نہیں کر سکتی، اور

اس طرح اسلام کا پیش کردہ نظام قیامت تک چلتا جائے گا اور دنیا اسی پر عمل کرنے

پر مجبور ہوگی۔

اسلام نے آئندہ کے لئے تو غلامی کا دروازہ بالکل بند ہی کر دیا، لیکن وہ ان

بے کس اور لاچار لوگوں کی حالت سے بھی بے خبر نہ رہا جن کی گردنیں اس زمانے

میں طوق غلامی میں جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ تو ناممکن تھا کہ ان سب کو یک قلم آزاد کر دیا جاتا کیونکہ اس طرح صدیوں کے قائم شدہ معاشرے کی بنیادیں اس طرح کمزور پڑ جاتیں کہ انھیں دوبارہ مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا بے حد مشکل ہو جاتا، تاہم اسلام نے ایسے اقدامات ضرور کئے جن کے باعث غلاموں کی تاریخ آزادی کا دروازہ کھل گیا اور اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں غلاموں کی ایک بھاری تعداد آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہو کر آزاد انسانوں کی صف میں شامل ہو گئی۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لئے طرح طرح کی راہیں کھولیں، ان کا آزاد کرنا کارِ ثواب قرار دیا۔ کئی دینی فرائض اور احکام کی خلاف ورزی کا کفارہ (صدقات اور غرباء و مساکین کو کھانا کھلانے کے ساتھ) غلاموں کو آزاد کرنا قرار دیا مسلمانوں کو جہاں والدین اور قریبی رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تلقین کی وہاں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید بھی کی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ
الْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَ
الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُكُمْ۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا۔

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم والدین، رشتے داروں، یتیموں، غریبوں، مسکینوں، قریبی پڑوسیوں، اجنبی پڑوسیوں، ہم نشینوں، مسافروں

اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اللہ تعالیٰ اکڑباز اور بے جا فخر و غرور کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غلاموں کا اتنا خیال تھا کہ مرض الموت میں آپ نے مسلمانوں کو جو آخری وصیت فرمائی۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ

(اے مسلمانو! میں تمھیں نماز کی ادائیگی اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہوں)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام زندگی بھر مسلمانوں کو اس اہم فرض کی طرف بڑے پر زور الفاظ میں توجہ دلاتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

"میرے حبیب جبریلؑ نے مجھے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی اتنی شدت سے تلقین کی کہ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ آئندہ ان لوگوں سے کوئی خدمت بھی نہیں لی جا سکے گی۔"

غلاموں کے جذبات کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ آپ یہ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ان کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس سے انھیں ٹھیس پہنچے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص اپنے غلام یا لونڈی کو عبد اور اَمَۃ کے لفظ سے نہ پکارے جس میں تحقیر کا پہلو پایا جاتا ہے بلکہ فتیٰ اور فتاۃ کا لفظ استعمال کرے جس میں محبت اور شفقت کا پہلو نمایاں ہے۔

اسلام کے نزدیک بغیر کسی قصور کے غلام کو مارنا اتنا بڑا گناہ ہے جس کا ازالہ اس غلام کو آزاد کرنے کی صورت ہی میں ممکن ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

"جو شخص اپنے غلام کو تھپڑ مارے اس پر کفارہ واجب ہے اور کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔"

اگر کوئی شخص اپنے غلام کو قتل کر دے تو فقہاء کے نزدیک قصاص میں اسے قتل کرنا واجب ہے۔

اسلام نے غلاموں کو جو بلند مرتبہ عطا کیا اور انھیں جتنی عزت بخشی اس کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی احکام کی رو سے مشرک آزاد عورت سے نکاح کرنا حرام ہے لیکن مسلمان لونڈی سے نکاح کرنے میں کسی قسم کی روک نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتّٰى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ۔ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ۔

(ترجمہ) تم مشرکوں سے اس وقت تک نکاح کا سلسلہ قائم نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً مومن غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے۔ خواہ آزاد مشرک تمھیں کتنا ہی پسند کیوں نہ ہو اور مومن لونڈی آزاد مشرک عورت

سے بہتر ہے۔ خواہ وہ تمھیں کتنی ہی پسند کیوں نہ ہو۔

اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ہاں کسی لونڈی کے بطن سے بچہ پیدا ہو جائے تو اس لونڈی کو آزاد کر دینا لازمی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر غلاموں سے جو سلوک فرمایا۔ اس کی روشن مثال حضرت زیدؓ بن حارثہ کی آزادی کا واقعہ ہے۔ حضرت زیدؓ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلام تھے۔ آپ نے از راہِ شفقت انھیں نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح بھی ان سے کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے ان کے لڑکے اسامہؓ کو شام جانے والے لشکر کا سپہ سالار بنایا اور بڑے بڑے صحابہ کو جن میں حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی شامل تھے ان کی ماتحتی میں دے دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے غلاموں کے بارے میں جو تعلیم دی اور جس سختی کے ساتھ مسلمانوں کو اُن سے ہر طرح حسنِ سلوک کرنے کی تاکید کی۔ اس کی مثال پردہ عالم پر پیش نہیں کی جا سکتی۔ آپ انھیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی شخص آپ کی دعوت کرنا چاہتا تھا تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بڑی خوشی سے قبول فرما لیتے تھے اور صحابہ کو بھی تاکید فرماتے رہتے تھے کہ "یہ غلام تمھارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تمھارے ماتحت کر دیا ہے تمھیں چاہیئے کہ جو کچھ تم کھاؤ وہی اُنھیں کھلاؤ اور جو تم پہنو وہی اُنھیں پہناؤ۔ انھیں

کوئی ایسا کام کرنے کے لیے نہ کہو جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کوئی بھاری کام ان کے سپرد کرو تو اس میں ان کی مدد کرو۔"

اس بارے میں سب سے پیارا قول وہ ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متعلق فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

"میں تو محض ایک بندہ ہوں۔ اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھاتا ہے اور اسی طرح زندگی گزارتا ہوں جس طرح غلام زندگی گزارتا ہے۔"

غلاموں کے متعلق یہ تعلیمات خالص انسانی ہمدردی کی بنا پر دی گئی تھیں۔ ان کا سماجی ضرورتوں اور اقتصادی مصلحتوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور اگر غور کیا جائے تو اس وقت جزیرہ نمائے عرب اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جو معاشی حالات پائے جاتے تھے۔ ان کی بنا پر غلاموں کی آزادی سماجی ضرورتوں اور اقتصادی مصلحتوں کے سراسر خلاف تھی۔

پھر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ غلاموں کے متعلق احکام اوائل اسلام ہی میں نازل ہونے شروع ہو گئے تھے اور ان احکام کی ظاہری دلکشی کو دیکھ کر حضرت بلال رضؓ اور دیگر غلام دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور انھوں نے اپنے ظالم آقاؤں کے ناقابلِ برداشت مظالم سے بچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں پناہ ڈھونڈی۔ یہ احکام آغاز اسلام میں نہیں بلکہ اس وقت نازل ہونے شروع ہوئے

جب مسلمانوں اور مشرکین میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور جنگی قیدیوں کا مسئلہ پہلی بار مسلمانوں کے سامنے آیا۔

حضرت بلالؓ اور دیگر غلام محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیم اور اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے نتیجہ میں اسلام نہیں لائے بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک اور ارفع و اعلیٰ نمونہ کو دیکھ کر اسلام قبول کرنے کی طرف راغب ہوئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعویٰ نبوت سے قبل کی ساری زندگی ان کے سامنے تھی۔ وہ روزانہ دیکھتے تھے کہ حضورؐ اپنے غلاموں اور دیگر بے کس و لاچار لوگوں سے کس درجہ شفقت اور رحم کا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں پتا تھا کہ حضورؐ کے ایک غلام زیدؓ بن حارثہ نے محض حضور کے عدیم المثال سلوک کے باعث ماں باپ رشتے داروں اور وطن سے ہمیشہ کی جدائی گوارا کرلی مگر اپنے شفیق آقا کی رفاقت ترک کرنا ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ کیا۔ حضورؐ کا یہی پاک نمونہ تھا جو مکہ کے کئی لوگوں کو جن میں آزاد بھی تھے اور غلام بھی، کشاں کشاں اسلام کی طرف لے آیا۔

جس طرح یہ خیال باطل ہے کہ مکہ کے غلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیم کی دلکشی کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہوئے اسی طرح یہ خیال بھی سراسر غلط ہے۔ کہ غلاموں نے اس لئے اسلام قبول کر لیا کہ اس طرح وہ ان بے پناہ مظالم سے نجات حاصل کرسکیں گے جو ان کے کافر آقا ان پر ڈھاتے رہتے تھے جو لوگ مذاہب عالم کی تاریخ سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی مذہب کے آغاز کا زمانہ قربانیوں

کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جو لوگ اس مذہب میں داخل ہوتے ہیں انھیں راحت و آرام ملنے کی بجائے مسلسل قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ یہی حال حضرت بلالؓ اور ان کے غلام ساتھیوں کا تھا۔ اسلام قبول کر کے راحت و سکون ملنا تو رہا درکنار، اُلٹا انھیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اس "جرم" کی پاداش میں ان پر سخت مظالم توڑے جانے لگے۔ دوسرے مسلمانوں کی چونکہ مکہ میں رشتے داریاں تھیں۔ اس لئے انھیں تو قدرے تحفظ حاصل تھا۔ لیکن غریب غلاموں کی پشت پر کون تھا جو ان کی حفاظت کرتا؟ یہی وجہ تھی کہ ان کے ظالم آقا ان پر جی بھر کر ظلم توڑتے اور نت نئی ایذائیں پہنچا کر انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے۔ لیکن ایمان کی جو دولت انھیں حاصل ہو چکی تھی اسے وہ کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

اسلام قبول کرتے وقت غلاموں کو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ اس طرح وہ غلامی سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے کیونکہ اس وقت مسلمان اتنی کمزوری کی حالت میں تھے کہ انھیں ان کے ظالم آقاؤں کے چنگل سے چھڑا کر کسی طرح آزادی نہ دلا سکتے تھے۔ جس وقت کوئی غلام کلمۂ توحید زبان پر لاتا تھا۔ اسی وقت اسے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کے لئے مصائب و آلام کا دروازہ کھل گیا ہے۔

پس ان حالات کی موجودگی میں یہ کہنا درست نہیں کہ غلاموں کے متعلق اسلام کے احکام ان کے ایمان لانے کا باعث بنے یا وہ راحت و آرام اور آزادی کے

لالچ میں اسلام لائے کیونکہ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے یہ احکام ظہور اسلام کے کافی عرصہ بعد نازل ہوئے۔ ابتدا میں تو غلاموں کو اسلام قبول کرتے ہی شدید مصائب و آلام اور مظالم کا سامنا کرنا پڑتا تھا سکون و اطمینان اور راحت و آرام پانے کا تو انہیں خیال بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

انسان کو اپنے عقائد دنیا کی ہر چیز سے محبوب تر ہوتے ہیں اور مال و دولت کے لالچ اور مزید آسائش زندگی حاصل کرنے کی خاطر بہت کم لوگ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے آبائی عقیدے کو چھوڑ کر کسی دوسرے عقیدے کو اسی وقت قبول کر سکتا ہے جب اسے اس کی حقانیت کا دل سے یقین ہو جائے۔ حضرت بلالؓ اور دیگر غلاموں کے اسلام لانے کا سبب بھی یہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی میں ان کے دلوں کو کھول دیا اور جونہی ان پر اسلام کی سچائی واضح ہو گئی۔ انھوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی اختیار کر لی۔ کسی قسم کے لالچ کا تو ان کے دل میں خیال بھی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ گو ان کے جسم غلامی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے دل مہبط انوار الٰہی تھے اور ان کی فطری استعداد دین حق کو قبول کرنے کے لئے بیتاب تھیں۔ اس لئے جونہی بطحائے مکہ میں توحید کی صدا بلند ہوئی انھوں نے بڑھ چڑھ کر اس پر لبیک کہا اور آنے والے خطرات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

بلالؓ

مؤرخین متفقہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ حضرت بلالؓ خالص حبشی نہ تھے بلکہ حبشہ کے "مولدین" میں سے تھے یعنی ان کی والدہ تو حبشیہ تھیں لیکن ان کے والد سرزمین عرب ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ جسم دبلا اور لمبا تھا سینہ آگے کو ابھرا ہوا تھا۔ سر پہ گھنے بال تھے۔ رخساروں پہ گوشت بہت کم تھا۔

ان اوصاف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص حبشی نہ تھے۔ کیونکہ اگر حبشی ہوتے تو ان کی ناک چپٹی ہوتی اور سر کے بال گھنگھریالے ہوتے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

ان کی جائے ولادت کے بارے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں ان کی

پیدائش مکہ میں ہوئی اور بعض کہتے ہیں 'سراۃ' میں۔ زیادہ قرین قیاس سراۃ ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک تو وہ یمن اور حبشہ کے قریب ہے جہاں مخلوط نسل کثرت سے پائی جاتی تھی۔ دوسرے ایک مرتبہ وہ شادی کی فکر میں بھی وہاں گئے تھے۔

جائے پیدائش کی طرح ان کے سن ولادت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہجرت سے تینتالیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ بعض ان کی ولادت اس سے بھی دس سال پہلے کی بتاتے ہیں۔

ان کے والد کا نام رباح اور والدہ کا نام حمامہ تھا۔ بعض لوگ انھیں از راہِ تحقیر ابن السوداء کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ ان کی والدہ سراۃ (اور اگر جائے ولادت مکہ قرار دی جائے تو مکہ) کے کسی شخص کی مملوکہ تھیں۔

بعض یورپی مورخین نے لکھا ہے کہ توحید کا سبق سب سے پہلے انھوں نے اپنی والدہ سے سیکھا تھا کیونکہ وہ سرزمین حبشہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اہل حبشہ بت پرستی کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے جونہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ میں توحید کی صدا بلند کی۔ بلال نے فوراً اس پر لبیک کہا۔ لیکن یہ توجیہہ درست معلوم نہیں ہوتی۔ حبشہ کے لوگ مسیحی تھے۔ جن کے عقائد عقیدۂ توحید کے سراسر مغائر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کی سخت مخالفت کی اور آسانی سے عقیدۂ توحید قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت بلال کے ایک بھائی تھے جن کا نام خالد

اور کنیت ابورویحہ تھی لیکن بعض قابلِ اعتماد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابورویحہ ان کے حقیقی بھائی نہ تھے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کردہ سلسلہ مواخاۃ میں بھائی بنے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی ایک بہن غفرہ نامی تھیں جو عمر بن عبد اللہ کی مملوکہ تھیں۔

حضرت بلال رضؓ کی پرورش مکہ میں قریش کے مشہور قبیلے بنو جمح میں ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مؤذنوں بلال رضؓ، ابو محذورہ رضؓ اور عمرو رضؓ بن ابن کلثوم نے مکے کے اسی قبیلے میں پرورش پائی۔ ہو سکتا ہے کہ اس قبیلے کو فطری طور پر سُر اور موسیقی سے کوئی مناسبت ہو جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے افراد کو اذان دینے کے لیے موزوں خیال فرمایا ہو۔

زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلے کے افراد تیروں کے ذریعے فال نکالا کرتے تھے۔ جب بنو عبد الدار اور بنو عبد مناف کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو انھوں نے بنو عبد الدار کا ساتھ دیا۔ اس لیے ان کے اور بنو عبد مناف کے درمیان مستقل عداوت پیدا ہو گئی۔

غالباً اسی قبیلے میں پرورش پانے کی وجہ سے حضرت بلال رضؓ کو جاہلیت کی رسوم سے سخت نفرت پیدا ہو گئی کیونکہ وہ دن رات دیکھتے رہتے تھے کہ مکاری اور دھوکا دہی کس طرح ان کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے اور رحم دلی اور اخلاق و مروت سے یہ لوگ کتنے دُور ہیں۔ یہی نفرت بالآخر ان کے اسلام لانے کا باعث بنی۔

یہ امر متحقق نہیں ہوسکا کہ حضرت بلالؓ بنو جمح میں سے کس کے غلام تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ قبیلے کی کسی معزز عورت کے پاس تھے۔ بعض لکھتے ہیں کہ ابوجہل کی رشتے دار کوئی بیوہ عورت آپ کی مالکہ تھی۔ بعض نے آپ کا آقا امیّہ بن خلف کو بتایا ہے۔

اس امر پر سب مورّخین متفق ہیں کہ آپ کو غلامی کے چنگل سے چھڑانے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ جب حضرت صدیقؓ نے دیکھا کہ اسلام لانے کی پاداش میں بلالؓ پر انتہائی روح فرسا مظالم توڑے جاتے اور انھیں طرح طرح کے عذاب دیئے جاتے ہیں تو انھوں نے پانچ اوقیہ اور بعض دیگر روایتوں کے مطابق نو اوقیہ سونے کے عوض انھیں ان کے مالک سے خرید لیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد کر دیا۔ بعض مورّخین نے لکھا ہے کہ انھیں بیچتے وقت مالک نے قیمت کے بارے میں جھگڑا شروع کر دیا اور قیمت بڑھانی شروع کر دی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اگر تم سو اوقیے تک بھی بڑھتے جاؤ گے تب بھی میں اس قیمت پر بلالؓ کو خرید لوں گا۔ بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ایک غلام کے بدلے میں انھیں خریدا تھا لیکن یہ روایت قطعاً بے بنیاد ہے اور حضرت صدیقؓ کی سرشت اور اخلاق کے بالکل منافی۔ وہ کسی صورت میں اپنے کسی غلام کو مشرکین کی ایذا دہی کا نشانہ بنانے کے لئے ان کے حوالے نہ کر سکتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت بلالؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد

کے ماتحت خریدا تھا۔ حضورؐ نے ان کی آسانی کے خیال سے نصف قیمت خود دینے کی پیش کش کی لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا: "یا رسول اللہ! میں نے بلالؓ کو آزاد کر دیا ہے۔"

آزادی کے بعد حضرت بلالؓ کو ان مظالم سے تو چھٹکارا مل گیا جو بحیثیت غلام ان پر ڈھائے جاتے تھے لیکن ان ایذاؤں سے رہائی نہ مل سکی جو بحیثیت مسلمان نہ صرف ان پر بلکہ تمام مسلمانوں پر روا رکھی جاتی تھیں۔ مکّہ کا ایک ایک فرد مسلمانوں کا دشمن ہو رہا تھا اور ان کی ایذا رسانی کے لئے نت نئی تدابیر اختیار کی جا رہی تھیں۔ مخالفت اور ایذا رسانی کا یہ سلسلہ دراز تر ہوتا گیا اور اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجبوراً اپنے صحابہ کو ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ دیگر صحابہ کے ساتھ حضرت بلالؓ بھی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے تاہم وطن کی محبت ان کے دل سے دُور نہ ہو سکی۔ مدینے کی آب و ہوا مہاجرین کو موافق نہ آئی اور وہ وہاں جا کر ملیریا میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت بلالؓ، حضرت ابوبکرؓ صدیق اور عامرؓ بن فہیرہ تینوں کا قیام ایک ہی گھر میں تھا اور تینوں کو بیک وقت بخار چڑھ آیا۔ حضرت بلالؓ پر جب بخار کی شدت غالب آتی تو وہ یہ اشعار پڑھتے ؎

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ ۔۔۔ بواد و حولی اذخر و جلیل

وھل اردن یوماً میاہ مجنّۃ ۔۔۔ وھل یبدون لی شامۃ و طفیل

(ترجمہ) کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی وقت ایسا بھی آئے گا جب میں وادیٔ مکّہ

میں رات گزاروں گا اور میرے گرد اذخر اور جلیل کی گھاس ہو گی اور کاش کوئی
دن ایسا بھی میسّر ہو گا جب میں مجنّہ کے چشمے سے پانی پیوں گا اور شامہ
اور طفیل کی پہاڑیاں میری نظروں کے سامنے ہوں گی۔

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرح کے مصائب اُٹھانے اور شدید ترین مظالم برداشت کرنے کے باوجود حضرت بلالؓ کا دل اس بستی کی محبت سے پوری طرح معمور تھا جہاں اُنھوں نے بچپن سے لے کر اس وقت تک کا زمانہ گزارا تھا۔

جس طرح مکّہ میں حضرت بلالؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی جدائی گوارا نہ تھی یہی حال اُن کا مدینہ میں بھی تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں جتنی جنگیں ہوئیں اور حضورؐ کو جتنے سفر درپیش ہوئے سب میں حضرت بلالؓ آپ کے ساتھ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھیں اسلام کا سب سے پہلا موذن ہونے کا شرف حاصل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات تک وہ بدستور یہ خدمت بجا لاتے رہے۔ ان کا طریق یہ تھا کہ اذان سے فارغ ہونے کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اطلاع دینے کی غرض سے آپ کے حجرے کے دروازے پر آجاتے اور بلند آواز سے کہتے:

حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح۔ الصلوٰۃ یا رسول اللہ۔

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نماز کے لئے تشریف لے آتے تو اقامت

کھتے اور نماز شروع ہو جاتی۔ بعض اوقات وہ اذان سے پہلے کوئی شعر بھی ترنّم سے پڑھ دیا کرتے تھے جس میں ان کی مظلومانہ حالت کا بیان ہوتا تھا۔ چنانچہ منجملہ ان شعروں کے ایک شعر یہ بھی تھا:

یا بلال ثکلتہ امّہ   وابتلّ من نضح دم جبینہ

(ترجمہ) بلال! اس وقت کو یاد کرو جب کفار تمہیں مکہ کی پتھریلی زمین پر گھسیٹا کرتے تھے اور خون سے تمہاری پیشانی تر بتر ہو جاتی تھی۔

عیدین اور نماز استسقاء کے موقعہ پر حضرت بلالؓ کا طریق یہ تھا کہ جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نماز کے لئے باہر تشریف لاتے تو وہ نیزہ لئے ہوئے آپ کے آگے آگے چلتے اور جس جگہ حضور کو نماز پڑھانی ہوتی اس سے ایک دو گز کے فاصلے پر وہ نیزہ زمین پر گاڑ دیتے۔ یہ نیزہ ان تین نیزوں میں سے ایک تھا جو نجاشی شاہِ حبشہ نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اپنے لئے رکھ لیا۔ دوسرا حضرت علیؓ بن ابی طالب کو دے دیا اور تیسرا حضرت عمرؓ بن خطاب کو مرحمت کر دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا نیزہ حضرت بلالؓ کی تحویل میں رہتا تھا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ اسے عیدین اور نماز استسقاء کے موقعہ پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے آگے لے کر چلتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت صدیقؓ کے عہد خلافت میں بھی ان کا یہی طریق رہا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں یہ خدمت سعد القرظ کے سپرد ہوئی۔ بعد میں

بھی کافی عرصے تک یہ نیزہ محفوظ رہا اور نیزہ بردار اسے لے کر خلفاء کے آگے چلتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کا سلسلہ جاری فرمایا تھا۔ حضرت بلالؓ کا بھائی آپ نے خالد ابورویحہ الخثعمی کو بنایا بعض کا خیال ہے کہ ابورویحہ کی مواخاۃ بلال کے ساتھ نہیں بلکہ ابوعبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب یا ابوعبیدہؓ بن الجراح کے ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی بھر بلالؓ اور ابورویحہؓ کے درمیان گہری دوستی رہی اس کے بالمقابل ابوعبیدہؓ بن حارث یا ابوعبیدہ بن الجراحؓ کی ابورویحہؓ سے دوستی کے متعلق تاریخ میں کوئی روایت موجود نہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالؓ کی تعلیم و تربیت کا بے حد خیال رکھتے تھے اور ہمیشہ مختلف نصائح سے سرفراز فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

"اے بلالؓ! مومن کا سب سے بہترین عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔"

اسی طرح فقر کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

"اے بلالؓ! ہمیشہ فقر اور غربت کی حالت میں زندگی بسر کرو اور غربت ہی کی حالت میں جان جانِ آفریں کے سپرد کرو۔"

بعض اوقات آپ انہیں سبق دینے کے لیے فرماتے:

"بلالؓ! میرے پاس کچھ مال جمع ہو گیا ہے میں اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تم اسے لے جاؤ اور مستحقین میں تقسیم کر دو تاکہ میرے دل سے ایک بوجھ اتر جائے۔"

دراصل اس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے عمل سے بلالؓ کو یہ سکھانا چاہتے تھے کہ انسان کو ہمیشہ قناعت کی زندگی اختیار کرنی چاہیئے اور مال جمع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ بلالؓ نے بھی اپنے آقا کے احکام اور نمونہ کی کامل پیروی کی اور آخری سانس تک اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا متبع اور فرمانبردار ثابت کیا۔

ایک مرتبہ عالم کشف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کا نظارہ دکھایا گیا اور آپ نے اپنے آگے بلالؓ کے قدموں کی آواز سنی۔ نماز کے بعد آپ نے پوچھا:
"بلالؓ! تمہیں اپنے کس عمل کے نتیجے میں سب سے زیادہ ثواب ملنے کی امید ہے۔ کیونکہ میں نے جنت میں تمہارے قدموں کی آواز اپنے آگے سنی ہے[1]۔"

[1] اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت بلال کو نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی قسم کی فضیلت حاصل تھی۔ جن کی بنا پر ان کے قدم جنت میں آپ سے آگے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خادم کا درجہ حاصل ہے۔ جس طرح دنیوی بادشاہوں کے خدام عصا لے کر ان کے آگے آگے چلتے ہیں۔ لیکن انھیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان

حضرت بلالؓ کی کسر نفسی دیکھو کہ اس وقت نہ انھوں نے اپنے زہد و قناعت کا ذکر کیا نہ جہاد فی سبیل اللہ کا۔ نیز ان تکالیف و مصائب کا جو آپ کو راہ حق میں اُٹھانی پڑیں۔ اور جنھیں آپ نے بڑے صبر و استقلال سے برداشت کیا اور نہ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا، بلکہ صرف یہ کہا:

"میں نے اسلام کے دوران میں کوئی ایسا غیر معمولی عمل نہیں کیا جس کی بنا پر میں بارگاہ خداوندی سے خاص ثواب کا مستحق ٹھہرایا جاؤں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں ہر وضو کے بعد دو رکعت نفل پڑھ لیا کرتا ہوں۔"

انکساری کا یہ کیسا اعلیٰ نمونہ ہے جو حضرت بلالؓ نے دکھایا۔

حضرت بلالؓ نے سفر و حضر اور جنگ و امن ہر ایک حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاسبان کے فرائض سرانجام دیئے۔ وہ دن رات آپ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے لیکن ان کی حیثیت ایک دنیوی بادشاہ کے ملازم جیسی نہ تھی۔ یہ کامل عشق و محبّت کا جذبہ تھا جو بلالؓ کو کسی وقت بھی اپنے محبوب آقا سے جُدا نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ حضورؐ کی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور ہمہ تن خدمت بجا لانے کے لئے تیار رہتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۷۹) خدام کو بادشاہ پر کسی قسم کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ یہ بادشاہ کے آگے آگے جا رہے ہیں۔ اسی طرح حضرت بلالؓ بھی روحانی مملکت کے سرتاج کے خادم کے طور پر اس کے آگے آگے چلتے تھے۔
(مترجم)

خواہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انھیں وہ خدمت بجا لانے کا ارشاد فرماتے یا نہ۔ سفر کے دوران میں جب دوپہر کا وقت آجاتا اور دھوپ شدت اختیار کر لیتی تو حضرت بلال ؓ بغیر کہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر چادر تان دیتے۔ غزوات کے موقعوں پر وہ میدانِ جنگ سے کچھ دور ایک سائبان کھڑا کر دیتے جہاں سے حضور جنگ کا نظارہ کرتے اور مناسب حال ضروری ہدایات دیتے رہتے تھے۔ جب تک جنگ جاری رہتی بلال ؓ برابر میدانِ جنگ اور حضور کے خیمے کے درمیان چکر لگاتے رہتے اور حضور کے احکام اور ضروری ہدایات فوج تک پہنچاتے رہتے۔

آٹھ سال کی جلاوطنی کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے بلال ؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دیں۔ جس وقت بلال ؓ کی آواز بطحائے مکہ میں گونجی اور اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے الفاظ ان کے منہ سے نکلے تو مشرکین کے دل رنج و الم سے بھر گئے اور ان میں سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شکر ہے کہ میرا باپ پہلے ہی مر گیا تھا۔ ورنہ وہ یہ الفاظ سننے کی تاب نہ لا سکتا۔ اذان کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ صرف تین آدمی تھے (۱) عثمان بن طلحہ، خانہ کعبہ کا کلید بردار (۲) اسامہ ؓ بن زید ؓ اپنے آزاد کردہ محبوب غلام کے محبوب لڑکے اور (۳) بلال ؓ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بلال ؓ برابر مؤذنِ رسول کے فرائض

سرانجام دیتے رہے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد کچھ دن تک تو انھوں نے اذان دی لیکن پھر معذوری کا اظہار کر دیا اور سخت اصرار کے باوجود اذان دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ جب ان کی زبان سے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدَ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ نکلتا۔ لیکن ان کی آنکھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھتیں تو ان پر سخت رقت طاری ہو جاتی اور دوسرے لوگ بھی فرطِ الم سے آنسو بہانے لگتے۔ اس طرح مسجدِ نبوی ایک ماتم کدہ بن جاتی۔ اپنے محبوب آقا کے بغیر مدینہ کی فضا میں انھیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ اس لئے انھوں نے مدینہ میں بیٹھ کر زندگی گزارنے پر باہر جا کر جہاد میں مشغول ہونے کو ترجیح دی۔ حالانکہ اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے شام جانے کی اجازت مانگی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت بلالؓ نے اتنا اصرار کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو انھیں مجبوراً اجازت دینی پڑی۔ لیکن بعض روایات میں ہے کہ حضرت صدیقؓ کی درخواست پر انھوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور ان کے عہد خلافت میں آپ مدینہ ہی میں مقیم رہے۔

جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے دوبارہ باہر جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمرؓ نے بھی انھیں روکنا چاہا۔ لیکن اس مرتبہ اصرار اتنا شدید تھا کہ حضرت عمرؓ کو اجازت دیتے ہی بن پڑی۔ وہ شام چلے گئے اور اسلامی لشکروں کے ساتھ مل کر جہاد میں مشغول ہو گئے۔ جنگوں کے اختتام پر وہ دمشق کے قرب و جوار

میں ایک چھوٹی سی جاگیر میں مقیم ہو گئے اور کھیتی باڑی کر کے اپنا گزارہ کرنے لگے۔

وفات کے وقت ان کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ طاعونِ عمواس میں فوت ہوئے جو ۱۷ھ میں پھیلی تھی۔ بعض نے ان کا سن وفات ۲۰ھ یا ۲۱ھ لکھا ہے۔ جاں کنی کے وقت انھیں اپنے حبیبؐ سے ملنے کی اس قدر خوشی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ جب ان کی بیوی ان کی حالت کو دیکھ کر رونے لگیں تو وہ کہتے۔

"تم روتی کیوں ہو؟ مجھے تو ایک لمبے عرصے کی جُدائی کے بعد رسول اللہؐ اور اپنے پیارے ساتھیوں کی مُلاقات کا موقعہ میسّر آ رہا ہے اور ہم کل انشاء اللہ ان سب سے ملیں گے۔"

وفات دمشق میں ہوئی اور باب الصغیر کے نزدیک دفن کیے گئے۔ ان کا مزار آج تک مرجع خلائق اور زیارت گاہِ خواص و عوام بنا ہوا ہے۔

صحابہ اور تابعین کے دلوں میں حضرت بلالؓ کی جو قدر و منزلت تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں شام کا دورہ کیا تو دمشق میں حضرت بلالؓ بھی آپ سے آ کر ملے۔ اس موقعہ پر بعض لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ بلالؓ اذان دیں۔ حضرت عمرؓ نے بھی اذان سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چنانچہ جب نماز کا وقت آیا تو بلالؓ کھڑے ہوئے اور امیر المومنین کی خواہش کے احترام میں اذان دینی شروع کی۔ اذان کا سُننا تھا کہ ہر طرف

سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ بڑے بڑے صحابہ جن میں خود حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور ان کے آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔

ایک آدمی کے اذان دینے پر تمام مسجد کا نالہ و شیون کی مجلس میں تبدیل ہو جانا عوام الناس کی نظروں میں بے حد تعجب انگیز تھا لیکن بلالؓ کی اذان ایک عام آدمی کی اذان سے بالکل مختلف تھی۔ یہ اذان اس دور کو یاد دلاتی تھی جب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ نبوی میں رونق افروز ہوا کرتے تھے اور بلال روزانہ پانچ وقت ان کے سامنے اذان دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان بلالؓ کی آواز سننے سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ اس لیے اتنے لمبے عرصے کے بعد جب ایک بار پھر ان کے کانوں میں وہی ندا آئی اور انھوں نے بلالؓ کی زبان سے اذان کے الفاظ سنے تو معاً ان کی نظروں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آگیا اور وہ اسے یاد کر کے زار و قطار رونے لگے۔

حضرت بلالؓ کی قدر و منزلت کا باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ شفقت و عنایت تھی جس کا مظاہرہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آخر وقت تک فرماتے رہے حضورؐ کی اُلفت و محبت سے جس قدر حصّہ بلالؓ نے لیا اور کسی صحابی نے نہیں لیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دینی تربیت ہی کا خیال نہیں رکھتے تھے بلکہ دُنیوی

ضرورتوں کا بھی آپ کو ہر دم دھیان رہتا تھا۔ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ ان کا نکاح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود کرایا تھا چنانچہ مذکور ہے کہ ابوالبکیر کے لڑکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا :

"یا رسول اللہ ! ہماری بہن کا رشتہ کہیں کرا دیجئے ۔"

آپ نے فرمایا :

"تم بلال رضؓ سے کیوں نہیں کر دیتے ؟"

یہ سن کر وہ واپس چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر آئے اور وہی درخواست دوبارہ پیش کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر وہی فرمایا :

"تم بلال رضؓ سے کیوں نہیں کر دیتے ؟"

یہ سن کر وہ پھر چلے گئے۔ تیسری مرتبہ پھر وہی درخواست لے کر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اب کے بھی انھیں یہی فرمایا :

"تم بلال رضؓ سے کیوں نہیں کر دیتے ؟ وہ اہلِ جنت میں سے ہے اور تمھیں اس سے اپنی بہن کا نکاح کر دینا چاہیئے ۔"

چنانچہ انھوں نے تیسری بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اپنی بہن کا نکاح بلال رضؓ سے کر دیا۔

اس نکاح کے بعد حضرت بلال رضؓ نے اور بھی کئی نکاح کئے۔ قتادہ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بنو زہرہ کی ایک بدوی عورت سے شادی کی تھی۔ ایک اور

روایت میں ہے کہ ان کی ایک بیوی کا نام ہندالخولانیہ تھا جو یمن سے تعلق رکھتی تھیں۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ کے کوئی اولاد نہ تھی بے شک مادی لحاظ سے اُنھوں نے دُنیا میں اپنی کوئی یادگار نہ چھوڑی لیکن روحانی لحاظ سے جو یادگار اُنھوں نے چھوڑی اس کا مقابلہ دُنیا کی کوئی یادگار نہیں کر سکتی اور وہ ہے اذان جو مسلسل چودہ سو برس سے تمام عالم اسلامی میں دی جا رہی ہے اور جسے سُنتے ہی انسان کا ذہن اسلام کے مؤذن اوّل حضرت بلالؓ بن رباح کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

بلالؓ کا قبولِ اسلام

ایمان کی علامت یہ ہے کہ اس کا دائرہ کسی فرد واحد تک محدود نہ ہو اور اس کی راہ میں کسی قسم کی کوئی مصلحت حائل نہ ہو سکے۔ اگر کوئی فرد واحد اپنے ذہن میں بعض نظریات قائم کر لیتا ہے لیکن اپنے علاوہ اور کسی شخص کو ان کا قائل نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا، تب ان نظریات کو ایمان کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر وقتی مصلحتوں کے پیش نظر غیر متبدل عقائد سے دستبرداری اختیار کر لی جائے تو خواہ اس کام میں سینکڑوں لوگ شریک ہوں، دنیا کا کوئی شخص انھیں ایمان و عرفان کا حامل یقین نہ کرے گا اور انھیں ضعیف الیقین اور ضعیف الایمان ہی سمجھا جائے گا۔ ایمان اور مصلحتِ وقت دو متضاد چیزیں ہیں اور کسی فرد واحد میں ان کا جمع ہونا ناممکن ہے۔ حقیقی مومن وہی کہلایا جا سکتا ہے جو وقتی مصلحتوں کو ایمان کی راہ میں قربان کر دے

اور اُسے خواہ کتنی ہی تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔ وہ اپنے عقیدے پر سختی سے قائم رہے۔ ایمان کا درجہ مصلحتوں سے بہت بالا ہے اور انسان کو حقیقی عزت تبھی مل سکتی ہے جب اس کا قدم ایمان و عرفان کے بلند مقام پر ہو۔

حضرت بلالؓ کے متعلق یہ بات قطعیت سے کہی جا سکتی ہے کہ انھیں ایمان کا حقیقی مقام حاصل تھا اور کسی قسم کی تخویف و ترہیب انھیں جادۂ استقامت سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر سب سے پہلے جن لوگوں نے لبیک کہا۔ وہ آٹھ اشخاص تھے۔ حضرت خدیجہؓ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عمارؓ اور اُن کی والدہ سمیہؓ۔ حضرت صہیبؓ۔ حضرت بلالؓ اور حضرت مقدادؓ۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا ذاتی اثر و رسوخ چونکہ مکہ میں بہت زبردست تھا اور ان کا قبیلہ بھی ان کی پشت پر تھا اس لیئے کفار ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ باقی مسلمان کمزور اور بے حیثیت تھے اور ان کا مکہ میں کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ اس لیئے کفار ان پر جی بھر کر مظالم ڈھاتے تھے۔ پیروں میں رسیاں باندھ کر مکہ کی پتھریلی زمین پر گھسیٹتے تھے۔ شدید گرمی کے موسم میں انھیں ننگا کر کے تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے اور ان کے اوپر بھاری پتھر رکھ دیتے لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں تپاتے۔ اس طرح انھیں شدید ایذائیں دے کر بعض لوگوں کے منہ سے اپنے حسب مطلب کلمات نکلوانے میں کامیاب ہو جاتے۔

لیکن بلال رضؓ نے انتہائی ثابت قدمی اور صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ کفار نے انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا۔ کسی قسم کی دھمکی نہ تھی جو اُنھیں نہ دی گئی ہو اور کسی قسم کا ظلم نہ تھا جو ان پر روا نہ رکھا گیا ہو۔ لیکن ان کی زبان پر ہمیشہ کلمۂ توحید ہی جاری رہا۔ طبقات ابن سعد میں ان مظالم کی قدرے تفصیل دی گئی ہے جو حضرت بلالؓ پر ڈھائے جاتے تھے۔ ذیل میں ہم وہ متعلقہ حصہ درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہو گا کہ راہِ حق میں بلالؓ نے کتنی قربانیاں پیش کیں :

"عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہ بلالؓ مومنین کے اس گروہ میں شامل تھے جو دنیوی لحاظ سے نہایت کمزور اور بے کس و بے بس تھا۔ جب وہ اسلام لائے تو انھیں کفار کی طرف سے قسم قسم کے عذاب دیئے جانے لگے تاکہ وہ ان کی تاب نہ لا کر اپنے دین سے پھر جائیں لیکن انھوں نے ان لوگوں کے سامنے ایک کلمہ بھی ایسا ادا نہ کیا جو ان کے حسب منشا ہوتا۔ جو شخص اُنھیں سب سے زیادہ عذاب دیتا تھا۔ وہ ان کا مالک اُمیّہ بن خلف تھا۔

عمیر بن اسحاق سے مروی ہے کہ جب ان لوگوں کی ایذا رسانیاں شدت اختیار کر جاتیں تو بلالؓ اَحَدٌ اَحَدٌ کہتے۔ لوگ ان سے کہتے "اس طرح کہو جس طرح ہم کہتے ہیں۔" تو وہ جواب دیتے کہ "جو تم کہتے ہو اسے میری زبان اچھی طرح ادا نہیں کر سکتی۔"

محمد سے مروی ہے کہ بلالؓ کو ان کے مالکوں نے پکڑ لیا۔ انھیں پچھاڑ کر ان پر پتھر اور گائے کی کھال ڈال دی اور کہا کہ تمھارا رب لات اور عزیٰ ہے۔ تم بھی اس کا اقرار کرو لیکن وہ اَحَد اَحَد ہی کہتے رہے۔ آخر جب مظالم کی حد ہو گئی تو ابوبکرؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور کہا:

"تم کب تک اس شخص کو عذاب دیتے جاؤ گے؟"

یہ کہہ کر انھیں سات اوقیہ (قریباً ۴۲ تولے سونے) کے عوض خرید لیا اور آزاد کر دیا۔

مجاہد سے مروی ہے کہ مکہ کے کمزور مسلمانوں پر کفار شدید مظالم ڈھاتے تھے۔ عمارؓ کی والدہ سمیہؓ کو ابوجہل نے نیزہ مار کر شہید کر دیا اور وہ اسلام میں سب سے پہلی شہید تھیں۔ بلالؓ پر وہ مظالم ڈھاتے ڈھاتے تھک گئے مگر انھوں نے حق کو نہ چھوڑا۔ وہ ان کی گردن میں رسّی باندھ دیتے اور لڑکوں کو کہتے کہ انھیں مکہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان گھسیٹیں مگر اس حالت میں بھی بلالؓ کی زبان سے ایک ہی کلمہ نکلتا تھا اور وہ تھا "اَحَد اَحَد"۔ وہ انھیں بری طرح زدوکوب کرتے، شدید گرمی کے موسم میں ننگا کر کے تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتے مگر بلالؓ کی زبان سے کلمۂ توحید کے سوا اور کوئی لفظ نہ نکلتا تھا۔"

عشق و محبت کی راہ میں ہر قسم کی ذلت برداشت کر کے اور ناقابل برداشت مظالم سہہ کر حضرت بلالؓ نے ایک ایسی مثال قائم کر دی جو قیامت تک طالبان

حق و صداقت کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی رہے گی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں حضرت بلالؓ ان اَلسّٰابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن میں شامل تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ندائے توحید سنتے ہی اس پر لبیک کہا تھا۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ بتوں کی پرستش کو چھوڑ کر خدائے واحد کے آگے سر جھکانے اور آسمانی فرستادے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا اور آگے چل کر انھیں کن کن عذابوں اور روح فرسا مظالم کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ان کے دل پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور بے نظیر اخلاق کا اتنا گہرا نقش ثبت ہو چکا تھا کہ کسی قسم کا ظلم و تشدد اور خطرناک سے خطرناک دھمکیاں بھی اسے محو نہ کر سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، انھوں نے بلا تامّل اسے قبول کر لیا۔ ایمان و عرفان کا یہ ایسا بلند ترین مقام تھا جو دو چار خوش نصیبوں کے سوا اور کسی کو حاصل نہ ہو سکا انھوں نے اسلام اس لئے قبول نہ کیا تھا کہ اس طرح انھیں اپنے ظالم آقاؤں کے ہاتھوں سے خلاصی نصیب ہو جائے گی یا حالتِ غلامی میں ان پر جو سختیاں بحیثیت غلام روا رکھی جاتی تھیں، ان میں کمی واقع ہو جائے گی۔

اس زمانے کے حالات کا مطالعہ کرنے سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ ابتدائی عہد کے مسلمانوں کے لئے وہ زمانہ نہایت نازک تھا۔ غلاموں کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل سے تعلق رکھنے والے جو اور لوگ اسلام لائے

تھے۔ ان کی حالت بھی غلاموں سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ اہل مکہ ان پر جی بھر کر ظلم و ستم ڈھاتے تھے اور انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ہر قسم کی سختی روا رکھتے تھے۔ ان حالات میں یہ اُمید کس طرح کی جا سکتی تھی کہ وہ اسلام قبول کرنے والے غلاموں کو قیدِ غلامی سے چھڑا سکیں گے، جبکہ خود ان کی اپنی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اُنھیں جان تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ یہ بات بھی عقل میں آنے والی نہیں کہ غلام اس لالچ میں آکر مسلمان ہو گئے تھے کہ اس طرح ان پر روا رکھی جانے والی سختیوں میں کمی آجائے گی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ابتدا میں اسلام قبول نہ کرتے بلکہ اس وقت کا انتظار کرتے جب ان کے مالک اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایمان لے آتے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم کے زیر اثر ان سے اچھا سلوک کرنے لگتے، یا کم از کم اس وقت تک انتظار کرتے جب تک مکہ کی بیشتر آبادی دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہو جاتی اور انھیں اپنے ظالم آقاؤں پر دباؤ ڈلوانے کا مضبوط ذریعہ میسر نہ آجاتا۔ اس زمانے میں تو اسلام قبول کرنے والوں کی بیشتر تعداد غریب، تہی دست اور کمزور و ناتواں لوگوں پر مشتمل تھی جو خود کفار کے مظالم کے مقابلے میں اپنا بچاؤ نہ کر سکتے تھے، چہ جائیکہ غلاموں پر ہونے والے ظلم و ستم کو روکتے۔

اگر غلاموں کے اسلام لانے کی یہ وجہ تسلیم کر لی جائے کہ اسلام نے غلاموں اور آزاد انسانوں کو مساوی حقوق دیئے تھے اور اس تعلیم کی دلکشی کو دیکھ کر انھوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت اختیار کر لی، تب سوال پیدا ہوتا ہے

کہ غلاموں کے سوا دوسرے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام سے قبل غلام اور آزاد مساوی سطح پر نہ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آزاد انسان غلاموں کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان سے ذلّت آمیز سلوک کرتے تھے۔ آخر آزاد انسانوں نے جو اپنے آپ کو ہر لحاظ سے غلاموں سے برتر خیال کرتے تھے، اس دین کو قبول کر لینا کیسے گوارا کر لیا جو مساوات انسانی کا علم بردار تھا اور جو غلاموں کو ان کے برابر لا کر سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنا چاہتا تھا؟ اگر بلالؓ اور صہیبؓ جیسے اشخاص نے اس لالچ میں اسلام قبول کر لیا تھا کہ اس طرح وہ رتبے میں ابوبکرؓ، حمزہؓ، علیؓ اور عمر فاروقؓ جیسے معززین قریش کے برابر ہو جائیں گے تو ان معززین نے اپنے رتبوں کو گرا کر ضعیف ونزار اور حقیر و ذلیل غلاموں کے ساتھ ایک سطح پر آجانے اور تمام قریش کی مخالفت اور انگشت نمائی مول لینے میں کیا مصلحت سمجھی تھی؟

حقیقت یہی ہے کہ نہ غلام اس لئے ایمان لائے تھے کہ اسلام نے انھیں اور آزاد لوگوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا اور نہ ہی آزاد لوگوں کے اسلام لانے کا سبب مساوات انسانی کی وہ تعلیم تھی جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر دنیا کے سامنے پیش کی۔ کیونکہ اس صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت مختلف گروہوں نے اپنی بعض مصلحتوں کی خاطر اسلام قبول کیا تھا:

حالانکہ اوّل تو ایمان اور مصلحت دو متضاد چیزیں ہیں جو کسی ایک دل میں کبھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے اسلام کی راہ میں مومنین اولین اور السابقون الاوّلون نے جو عظیم الشان قربانیاں پیش کیں اور جس طرح اپنی جانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی راہ میں فدا کیں وہ اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ انھوں نے کسی مصلحت کی خاطر اسلام قبول نہیں کیا۔ حقیقی ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب انسان کسی چیز کو حق سمجھ کر قبول کرتا ہے تو اسے خواہ کتنی ہی آفات و مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے وہ چٹان کی طرح اس پر قائم رہتا ہے اور اپنی جان کی پروا تک نہیں کرتا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ کیا ایسا شخص جسے ایک نیا دین قبول کرنے کی پاداش میں تپتے ہوئے صحرا میں جھلستی ہوئی ریت پر لٹا کر اس کے سینے پر بھاری بھاری پتھر رکھے جاتے ہوں اور اس طرح اسے اپنا عقیدہ چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہو، اپنے آپ کو اس لالچ میں ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لئے پیش کر سکتا ہے کہ اس طرح اسے اپنے ظالم آقاؤں سے مخلصی نصیب ہو جائے گی اور کیا اس شخص کے متعلق جس کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کے سوا اور کوئی لفظ نہ نکلتا ہو اور کسی قسم کا ظلم و تشدد اسے یہ الفاظ کہنے سے باز نہ رکھتا ہو، یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اپنے آبائی دین (بت پرستی) اور اسلام کے درمیان موازنہ کرنے کی صلاحیت نہ تھی اور اسے اسلام کے متعلق اس سے زیادہ اور کوئی واقفیت حاصل نہ تھی کہ وہ غلاموں سے بہتر سلوک کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور بس۔

بُتوں کی تعظیم پر آمادہ نہ ہونے اور بار بار عقیدہ توحید کا برملا اظہار کرنے کی پاداش میں مشرکین مکہ نے بلالؓ پر جو مظالم ڈھائے ان کا مختصر سا حال گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان مظالم کی شدت جانکنی کی سختی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ کفار کو تو انھیں قتل کرنے میں بھی کوئی باک نہ ہوتا اگر انھیں یہ خیال نہ ہوتا کہ اس طرح ایک غلام ہاتھ سے جائے گا اور وہ آئندہ کے لئے اس سے کسی طرح کا نفع حاصل نہ کر سکیں گے۔ اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ انھیں خرید نہ لیتے تو عجب نہ تھا کہ مشرکین مایوس ہو کر انھیں بھی حضرت عمارؓ کی والدہ سمیہؓ کی طرح شہید کر ڈالتے۔ ان حالات سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ بلالؓ نے مظالم کی شدت سے چھٹکارا پانے کی خاطر اسلام قبول نہ کیا تھا بلکہ اس کے برعکس انھوں نے تو اسلام قبول کر کے پہلے سے دگنا سہ گنا عذاب مول لے لیا تھا۔

اگر غور کیا جائے تو حضرت بلالؓ پر جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے تھے وہ انسانی برداشت سے باہر تھے۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ان کے باقی رفقاء ان مظالم کی تاب نہ لا کر وہ الفاظ کہنے پر مجبور ہو گئے جو مشرکین مکہ ان سے کہلوانا چاہتے تھے حتیٰ کہ عمارؓ بن یاسرؓ جیسی شخصیت بھی جس نے بڑھاپے میں موت کے خوف کو پاس تک نہ پھٹکنے دیا تھا، جوانی کے عالم میں ان دردناک مظالم اور عذابوں کی تاب نہ لا سکی اور اسے کفار کے حسب منشا الفاظ منہ سے نکالنے ہی پڑے۔

حضرت عمارؓ نے اس وقت حضرت علیؓ کے ساتھ جنگِ صفین میں شرکت کی۔ جب ان کی عمر نوے برس سے متجاوز ہو چکی تھی اور وہ اسی جنگ میں دادِ شجاعت دیتے دیتے شہید ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے زمانوں میں بھی وہ تمام جنگوں میں شریک رہے۔ ان کا ایمان اس طرح مضبوط تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "ایمان عمارؓ کے رؤیں رؤیں میں رچا ہوا ہے۔" مسلمانوں کو آپ کی یہ نصیحت تھی کہ وہ ابو بکرؓ اور عمرؓ کے نمونے کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ عمارؓ کی شخصیت کو بھی پیش نظر رکھیں۔ اس میں بھی کسی قسم کا شبہ نہیں کہ وہ آسودگی اور راحت و آرام کے لالچ میں اسلام نہ لائے تھے۔ کیونکہ اگر انھیں مال و منال اور آرام و آسائش کا لالچ ہوتا تو وہ یقیناً جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کے جھنڈے تلے جنگ کرنے کی بجائے معاویہؓ کا ساتھی بننا قبول کرتے کیونکہ مال و منال معاویہؓ ہی کے پاس سے مل سکتا تھا۔ حضرت علیؓ کو تو اگر جنگ میں فتح بھی ہو جاتی۔ تب بھی وہ انھیں مال و زر سے نہ نوازتے اور ان کو بدستور وہی سادہ زندگی بسر کرنی پڑتی۔ جو اب تک وہ بسر کرتے چلے آ رہے تھے۔

حضرت عمارؓ کو ایمان کا وہ بلند مقام حاصل تھا جہاں تک بہت کم خوش نصیب رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کا ایمان خالص سونے کی ڈلی کی طرح تھا جس میں کسی قسم کی طمع اور نفسانی خواہش کو دخل نہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کسی عقیدے کو

صدق دل سے اختیار کرنے کے بعد پھر اسے چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کرتے۔ ان کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انھیں رضائے الٰہی حاصل ہو جائے۔ رضائے الٰہی کی خاطر انھوں نے ہر قسم کی قربانیاں پیش کیں۔ موت ان کی نظروں میں اس قدر حقیر تھی کہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ نوّے برس کی عمر تک وہ برابر غزوات میں شریک ہوتے رہے اور آخر معرکۂ صفین میں شہادت حاصل کی۔ تاہم اس قدر صادق الایمان ہونے کے باوجود وہ مشرکین مکّہ کے ہولناک مظالم برداشت نہ کر سکے۔ لیکن حضرت بلالؓ نے ان مظالم کو حیرت انگیز صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ اور زبان سے اُف تک نہ کی۔ اگر اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں انھیں کسی فائدے کی اُمید ہوتی تب وہ یقیناً یہ مظالم برداشت کرنے کے مقابلے میں ان فوائد سے دست بردار ہونے کو ترجیح دیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو اس طرح نورِ ایمان سے منور کر رکھا تھا کہ دُنیا کی کوئی طاقت انھیں اس عقیدے سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو اُنھوں نے خوب سمجھ کر صدقِ دل کے ساتھ اختیار کیا تھا۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ آغازِ اسلام میں ندائے توحید پر لبیک کہنے کی سعادت زیادہ تر غلاموں ہی کو نصیب ہوئی۔ اپنے آپ کو معزز و مکرم سمجھنے والے بیشتر لوگ اس سعادت سے محروم ہی رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش کے آزاد لوگوں کی راہ میں قدم قدم پر گوناگوں مصلحتیں حائل تھیں جو اُنھیں اسلام قبول کرنے

سے روکتی تھیں۔ کسی کو یہ خیال تھا کہ اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں اس کی ساری عزّت خاک میں مل جائے گی۔ کسی کو خدشہ تھا کہ اس کی تجارت کا بیڑا غرق ہوجائے گا کسی کو یہ خوف تھا کہ سارا قبیلہ اس کا دشمن ہوجائے گا۔ کسی کو رشتے داروں کی مخالفت کا ڈر کھائے جا رہا تھا۔ لیکن بے چارے غلام ان سارے خرخشوں سے آزاد تھے۔ نہ انھیں اپنی عزّت پر حرف آنے کا ڈر تھا اور نہ تجارت پر بُرا اثر پڑنے کا خوف۔ نہ قبیلے کے ناراض ہوجانے کا خدشہ تھا اور نہ رشتے داروں کے ساتھ چھوڑ دینے کا اندیشہ۔ ان کی سرشت ہی اس قسم کی تھی کہ وہ حق کو قبول کرنے میں کسی قسم کا تامّل نہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے پُورے خلوص اور صدق دل سے اسلام قبول کیا اور اس راہ میں جس قدر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا اُنھیں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

دیگر غلاموں کی طرح حضرت بلالؓ کا دل بھی مودّت و اخلاص اور فرمانبرداری اور اطاعت کے جذبات سے معمور تھا۔ ان کا آئینۂ دل کدورت سے بالکل صاف تھا۔ اس لیے جونہی اُنھوں نے مکّہ کی گلیوں میں قریش کے سب سے معزز خاندان (بنو ہاشم) کے معزز ترین فرد کو توحید کی منادی کرتے اور مساوات انسانی کی تلقین کرتے سُنا وہ فوراً اس پر ایمان لے آئے۔ یقیناً ان کے دماغ میں بجلی کی طرح یہ خیال آیا ہوگا کہ وہ شخص جو طبقاتی تفاوت ختم کرکے غلاموں اور ان کے آقاؤں کو ایک سطح پر دیکھنا چاہتا ہے اور مکّہ کا معزز ترین انسان ہو کر مساوات انسانی کا یُوں جو ہی علم بردار ہے

وہ بلا شبہ ایک عظیم ہستی ہے اور ناممکن ہے کہ اس کی لائی ہوئی تعلیم خدا کی طرف سے نہ ہو۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص، جسے سارے مکہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہے اور شہر کا ایک ایک فرد اس سے غایت درجہ ادب اور تعظیم سے پیش آتا ہے، غلاموں اور انہی کی طرح کی بیکس اور لاچار مخلوق کی وکالت کر کے اپنی عزت کو خاک میں ملا لے، تاوقتیکہ اس کا تعلق اس بلند و بالا ہستی سے نہ ہو جو امیر و غریب، عربی و عجمی اور آزاد اور غلام میں کوئی فرق نہیں کرتی اور اپنے افضال و انعامات سے سب مخلوق کو یکساں طور پر بہرہ مند کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات آزاد انسانوں کی نسبت غلاموں کے دلوں میں زیادہ شدت کے ساتھ پیدا ہو سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس سرعت کے ساتھ غلاموں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا، اپنے آپ کو معزز و مکرم کہلانے والے آزاد انسانوں نے نہیں کہا۔ موخر الذکر نسلی غرور اور عجب پندار کے جذبات میں سرشار رہے اور حقیر و ذلیل غلاموں نے آگے بڑھ کر وہ دولت حاصل کر لی جس کے باعث قیامت تک آنے والی نسلیں ان پر رشک کرتی رہیں گی اور جسے کھو دینے پر مکہ کے معزز ترین افراد ہمیشہ ہی کف افسوس ملتے رہے۔

ایک مرتبہ اسلام قبول کرنے کے بعد پھر بلال رضی اللہ عنہ کے لیے قدم پیچھے ہٹانا ناممکن تھا۔ کسی قسم کا ظلم و ستم اس مرد وفا سرشت کو جادۂ استقامت سے متزلزل نہ کر سکتا تھا۔ ایمان ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا تھا۔ ان کے لئے اب حقیقی خوشی

یہی تھی کہ انھیں اپنے محبوب حقیقی کا قرب حاصل رہے اور ایمان کی دولت ان سے کسی وقت بھی جدا نہ ہو۔ بلکہ اس میں برابر زیادتی ہی ہوتی چلی جائے۔ اس "جرم" کی پاداش میں مشرکین نے ان پر جو سختیاں کیں اور جس قسم کے انسانیت سوز مظالم ڈھائے ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن اُنھوں نے اطمینانِ قلب اور روحانی سکون کی خاطر ان تمام مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور دنیا کو دکھلا دیا کہ حقیقی وفاداری اور اطاعت گزاری کس چیز کا نام ہے۔

عشق و محبت، صدق و ثبات، عزم و استقلال اور صبر و شکیب کے جو عدیم المثال نمونے حضرت بلالؓ نے قائم کیے۔ ان سے متاثر ہو کر بڑے سے بڑا صحابی انھیں انتہائی تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ تو فرطِ جذبات میں یہاں تک کہا کرتے تھے:

"ابوبکرؓ ہمارے سردار تھے اور انھوں نے ہمارے سردار بلالؓ کو آزاد کیا۔"

حضرت عمرؓ کے دل میں بلالؓ اور اُن کے رفقاء کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

ایک مرتبہ ابوسفیان بن حرب، سہیل بن عمرو بن حارث اور عرب کے بعض بڑے بڑے سردار حضرت عمرؓ سے ملاقات کرنے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ اتفاق سے اسی وقت بلالؓ اور صہیبؓ بھی آ گئے۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے بلالؓ اور صہیبؓ کو تو اسی وقت اپنے پاس بلا لیا لیکن سردارانِ قریش باہر ہی انتظار

کرتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر ابو سفیان نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "یہ ذلت بھی ہمارے ہی نصیب میں لکھی تھی۔ خدا کی شان ہے۔ غلاموں کو تو فوراً اذنِ باریابی حاصل ہو جائے اور سردارانِ عرب دروازہ ہی پہ بیٹھے رہیں۔"
سہیل بن عمرو کا جذبۂ ایمانی ابو سفیان سے کچھ بڑھ کر تھا۔ انھوں نے یہ بات سُن کر کہا

"پھر قصور کس کا ہے؟ بلانے والے نے سب کو ایک آواز سے بلایا۔ ہم نے اس آواز کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر رد کر دیا اور اس کی سخت مخالفت کی لیکن ان غلاموں نے آگے بڑھ کر اس پہ لبیک کہا۔ اب انہی کا حق ہے کہ وہ دُنیا و آخرت میں ہر لحاظ سے ہم پر فائق سمجھے جائیں۔ ہمارے لئے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں۔"

بلالؓ کے اوصاف

حضرت بلالؓ قدرت کی طرف سے فطرتِ صحیحہ لے کر آئے تھے اور تادمِ آخر اسی پر قائم رہے۔ نسلی اور قومی خصائل ان میں پوری طرح جلوہ گر تھے اور وہ اپنی قوم کے اخلاق و عادات کا صحیح نمونہ تھے۔

افریقی غلاموں کا یہ خاصہ تھا کہ جو شخص ان سے بُرا سلوک کرتا تھا وہ اس کے جانی دشمن بن جاتے تھے لیکن نیک اور اچھا برتاؤ کرنے والے سے انتہائی وفاداری اور کامل مودت و اخلاص سے پیش آتے تھے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کا دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

حضرت بلالؓ میں بھی یہ صفات بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ بھی اپنے سے نیک سلوک کرنے والوں کے انتہائی وفادار اور مخلص دوست اور بُرا سلوک کرنے والوں

کے بدترین دشمن تھے۔ تاہم وہ اپنی جانب سے بُرائی میں کبھی پہل نہ کرتے تھے۔ جن لوگوں نے بلالؓ پر ظلم وستم ڈھائے اور انھیں ذلیل ورسوا کرنے کی کوششیں کیں حضرت بلالؓ انھیں کبھی فراموش نہ کرسکے۔ غلامی کے دوران میں بھی جب کہ وہ بالکل بے دست وپا تھے وہ اپنے ظالم آقاؤں پر اپنے قول وفعل سے یہ ظاہر کرتے رہتے تھے کہ وہ دل سے ان کے سلوک کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے انھیں ان کی مالکہ سے خریدنا چاہا تو اس نے متعجب ہو کر کہا:

"تم اسے خرید کر کیا کرو گے؟ یہ شخص تو ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کسی قسم کا تعلق رکھا جائے۔ یہ تو بہت کینہ ور اور بُری طبیعت کا انسان ہے۔"

لیکن جس قسم کے مظالم بلالؓ پر روا رکھے جاتے تھے۔ ان کی موجودگی میں کس طرح یہ توقع رکھی جا سکتی تھی کہ بلالؓ خوش دلی اور خندہ پیشانی سے اپنے مالکوں کا کام سرانجام دیتے۔ اگر کسی شخص سے معمولی بدسلوکی بھی کی جائے تو وہ تمام عمر کے لئے اس کے خلاف دل میں گرہ باندھ لیتا ہے۔ حضرت بلالؓ پر تو وہ مظالم ڈھائے گئے جن کا ذکر سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان پر تو اثر ہونا لازمی تھا اور ان کے دل میں اپنے مالکوں کے خلاف جس قدر جذباتِ حقارت پیدا ہوتے کم تھے۔

ویسے اپنی فطرت کے لحاظ سے حضرت بلالؓ بہت پاک دل اور صادق الایمان شخص تھے اور کینہ وعداوت سے کوسوں دُور۔ ان کا چہرہ ایک ایسے آئینے کی

مانند تھا جس میں ہر انسان کو اپنی اصلی تصویر نظر آتی ہے۔

اپنی فطری پاکیزگی کے باعث ان میں اطاعت اور سچی وفاداری کا جذبہ بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ ان کا اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اس بات کو آشکارا کرتی تھی کہ انھوں نے اپنی قوم کے اخلاق حسنہ کو کس طرح اپنے اندر سمو لیا تھا۔

ان کی زندگی کا مقصد وحید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں زندگی گزارنا تھا۔ حضورؐ کے بغیر انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی کل نہ پڑتی تھی اور حضورؐ کی وفات کے بعد کا سارا زمانہ انھوں نے اپنے محبوب کی یاد میں تڑپتے ہوئے گزارا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدموں میں حاضر رہنے کی جو تڑپ ان کے دل میں تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان کی بیوی نے شدت رنج و الم میں آنسو بہانے شروع کیے، حضرت بلالؓ نے جب شریک حیات کو روتے دیکھا تو فرمایا:

"تم روتی کیوں ہو؟ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کل ہم اپنے رفیقوں سے ملیں گے کل ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہوگا۔"

حضرت بلالؓ کا ایک اور نمایاں وصف صدق و راستبازی تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی بیوی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سنائی۔ اس نے کچھ شک و شبہ کا اظہار کیا۔ بلالؓ کو اس کی تاب کہاں تھی کہ کوئی شخص ان کی بتائی

ہوئی حدیث پر شک کرے ۔ وہ غصے میں بھرے ہوئے اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے اور سارا ماجرا عرض کیا ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے ساتھ ان کے گھر پر تشریف لائے اور ان کی بیوی سے فرمایا :

" بلال رضی میری جو حدیث تم سے بیان کرے تم اس پر یقین کر لیا کرو اور اسے ناراض نہ کیا کرو ۔ وہ جھوٹ بولنے والا آدمی نہیں ہے ۔ "

حضرت بلال رض کی راست بازی پر لوگوں کو اتنا یقین تھا کہ وہ اپنی آنکھوں پہ تو شک کر لیتے تھے لیکن بلال رض انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بات بتاتے تھے اس پر کسی طرح بھی شک نہ کرتے تھے ۔

صحرائے عرب میں جہاں سورج غروب ہونے کے بعد بھی دن کی روشنی باقی رہتی ہے اور طلوع ہونے سے قبل ہی روشنی نظر آنے لگتی ہے ۔ بعض مسلمانوں کو رمضان کے مہینے میں افطار و سحر کے وقت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس وقت بلال کی ذات ہی لوگوں کی رہنمائی کا موجب ہوتی تھی ۔ جب وہ مسجد میں آکر یہ اعلان کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کھانی موقوف کر دی تو لوگ فوراً کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے اور انھیں یقین ہو جاتا کہ وقت سحر ختم ہو گیا ۔ اسی طرح مغرب کے وقت جب وہ یہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ افطار کر لیا تو لوگ ان کی بات پر یقین کر کے بلا تامل روزہ افطار کر لیتے خواہ روشنی کتنی ہی باقی کیوں نہ ہوتی ۔

حضرت بلالؓ ہر بات میں سچائی کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے خواہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل سے ہوتا یا ان کی اپنی یا کسی دوست کی ذات سے۔ ایک مرتبہ ان کے اسلامی بھائی ابو رویحہؓ نے یمن کے کسی قبیلے میں شادی کرنی چاہی۔ چونکہ وہ اہل قبیلہ کے نزدیک بالکل اجنبی تھے اس لیے انھوں نے بلالؓ سے کہا کہ وہ چل کر ان کی سفارش کر دیں۔ بلالؓ ان کے ساتھ گئے اور جا کر صرف اتنا کہا:

"میں بلالؓ بن رباح ہوں اور یہ میرے بھائی ابو رویحہؓ ہیں جو تم سے سلسلہ ازدواج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طبیعت کے متعلق میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان میں غصہ بہت پایا جاتا ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دو۔ اور چاہو تو انکار کر دو۔"

بلالؓ کی یہ بات سن کر لڑکی کے والدین نے فوراً حامی بھر لی۔ کیونکہ وہ ان کی سفارش کو کسی صورت میں رد نہیں کر سکتے تھے۔

ابو رویحہؓ سے ان کی محبت و اخلاص اور مہر و وفا کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں تنخواہوں اور وظیفوں کے رجسٹر مرتب کیے تو حضرت بلالؓ شام میں مجاہدین کے ساتھ مقیم تھے۔ امیرالمومنین نے ان سے دریافت کیا کہ بلالؓ! تمہارا نام کس کے ساتھ رکھا جائے؟" انھوں نے کہا" ابو رویحہؓ کے ساتھ جنھیں میں اس اخوت کے باعث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے

درمیان قائم کرائی تھی۔ کبھی نہ چھوڑوں گا۔"

اس واقعہ سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔ اوّل یہ کہ حضرت بلالؓ میں وفاداری اور اخلاص کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا اور وہ جس سے ایک مرتبہ پیمانِ وفا باندھ لیتے تھے، تا دمِ آخر اس پر قائم رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی عظمت تھی کہ حضورؐ نے جس شخص کو ان کا بھائی بنا دیا انھوں نے صدقِ دل سے اسے اپنا بھائی سمجھ لیا اور عمر بھر اس سے بھائیوں جیسا ہی سلوک کیا۔

حضرت بلالؓ کا ایک اور نمایاں وصف امانت و دیانت تھا اور اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کا تمام انتظام انہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ حضورؐ کی گھریلو ضروریات کا بندوبست بھی انہی کے ذمّہ تھا۔ حضورؐ سفر و حضر میں انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنا وہ نیزہ جو نجاشی نے تحفۃً بھیجا تھا آپ نے بلالؓ ہی کے حوالے کر دیا تھا اور وہ عیدین اور نمازِ استسقاء کے موقعوں پہ اسے آپ کے آگے آگے لے کر چلتے تھے۔ صحابہ میں ہمیں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی گہری رفاقت نصیب ہوئی ہو جتنی بلالؓ کو تھی۔ جب نماز کا وقت ہوتا تو وہ سرورِ کائناتؐ کے بالکل پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے۔ نماز کے علاوہ دن کے دوسرے حصّوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام

کے گھریلو کام سرانجام دیتے۔ حضورؐ کے پاس جو اموال آتے انھیں محفوظ رکھتے سفر کے دوران میں جب کبھی پڑاؤ کا وقت آتا تو حضورؐ کے لئے خیمہ خود نصب کرتے اور دوپہر کے وقت سایہ دار جگہ کا انتظام کرتے۔ حضورؐ کی سواری کے آگے آگے صرف انہی کی اونٹنی ہوتی تھی۔ بعض اوقات انھیں "قصواء" پر سفر کرنے کا بھی موقع ملتا۔ حالانکہ یہ اونٹنی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھی اور حضورؐ کے سوا اور کوئی شخص اس پر سوار نہ ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضورؐ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ساتھ صرف تین آدمی تھے۔ عثمانؓ بن طلحہ کلید بردار خانہ کعبہ، اسامہؓ بن زید اور بلالؓ۔

حضورؐ کی وفات کے بعد بھی یہ رفاقت قائم رہی۔ تجہیز و تکفین کا کام جن معدودے چند صحابہ نے سرانجام دیا۔ ان میں حضرت بلالؓ بھی شامل تھے۔ حضورؐ کو سپرد خاک کرنے کے بعد آپ ہی نے مشک کے ذریعہ حضورؐ کی لحد پر پانی چھڑکا اور اس طرح تجہیز و تکفین کے سلسلے میں آخری کام سرانجام دینے کی سعادت آپ ہی کو نصیب ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید عشق و محبت کی ایک نفسیاتی وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ حضرت بلالؓ کی طبیعت دیگر ابنائے وطن کی طرح انتہا پسند تھی۔ اگر انھیں کسی سے لگاؤ ہوتا تھا تو شدید لگاؤ ہوتا تھا اور اگر نفرت ہوتی تھی تو شدید نفرت ہوتی

تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت اور اسلام سے گہرا تعلق تھا۔ وہاں مشرکین مکہ سے شدید نفرت تھی اور انھوں نے اس نفرت کو کبھی بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

اس جگہ یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ نفرت اور بغض و عداوت کبھی قابل تعریف ہوتا ہے اور کبھی قابل مذمت۔ اگر راہِ حق و صداقت میں کسی شخص سے بغض و عداوت کا سلوک کیا جائے تو وہ یقیناً قابل تعریف ہوتا ہے لیکن اگر دشمنی اور عناد کی بنیاد ذاتیات پر رکھی جائے تو یقیناً اسے ہر لحاظ سے قابل نفرت سمجھا جائے گا۔ حضرت بلال رضی کی سیرت کا یہ روشن پہلو ہے کہ مشرکین مکہ سے ان کی نفرت کسی ذاتی عناد کی بنا پر نہیں تھی بلکہ محض اس لئے تھی کہ وہ اسلام اور بانیِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے۔ بلال رضی کو بھی وہ اپنے دردناک مظالم کا نشانہ اسی لئے بنایا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے آقاؤں کا مذہب چھوڑ کر ندائے توحید پر لبیک کہا تھا اور کسی قسم کی دھمکی اور کسی قسم کا لالچ انھیں جادۂ استقامت سے ہٹا نہ سکا تھا۔

حضرت بلال رضی میں یہ غیر معمولی استقامت اس لئے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ فطری طور پر اپنے موقف پر سختی سے قائم رہنے والے تھے۔ اس کا ایک نظارہ ہمیں اس موقعہ پر نظر آتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھوں نے اذان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے دل میں یہ امر جاگزین ہو چکا تھا

کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے بعد اذان دینا وفاداری کے خلاف اور اس پیمانِ وفا کے منافی ہے جو اُنھوں نے اپنے پیارے آقا سے باندھا تھا۔ اذان دینا تو رہا درکنار، اُنھیں اپنے محبوب کی جُدائی کے بعد مدینہ میں زندگی کاٹنی دشوار ہو گئی اور اُنھوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اصرار کیا کہ انھیں شام جا کر جہاد میں حصّہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حضرت صدیقؓ نے کچھ لیس و پیش کیا تو اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ نے مجھے اپنے لئے آزاد کیا تھا تب تو مجھے بیشک روک لیجئے لیکن اگر خدائے عزّ و جلّ کی خاطر آزاد کیا تھا تب مجھے جانے دیجئے۔ اس قدر اصرار دیکھ کر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انھیں مجبوراً شام جانے کی اجازت دے دی۔

اس میں شک نہیں کہ کسی ایسے آدمی سے جس پر بلیے عرصے تک ظلم و ستم ڈھائے گئے ہوں اور اسے ہر قسم کی ایذا رسانی کا نشانہ بنایا گیا ہو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے دشمنوں سے نرمی اور ملاطفت کا سلوک کرے گا۔ خصوصاً جنگ کے موقعہ پر تو کسی نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت بلالؓ بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہ تھے اور سختیاں سہہ سہہ کر ان کا دل بھی سخت ہو گیا تھا۔

جنگِ خیبر کے موقعہ پر جب قلعہ قموص فتح ہوا تو قلعہ کے سردار کی لڑکی صفیہ اور ایک اور کم سن لڑکی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان دونوں کو بلالؓ کے ساتھ قلعہ میں واپس بھیج دیا۔ بلالؓ انھیں اس جگہ کے قریب سے لے کر گزرے جہاں قلعہ کے مقتولین پڑے ہوئے تھے۔ یہ

منظر دیکھ کر چھوٹی لڑکی چیخنے چلانے لگی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ بلال رضؓ پر ناراض ہوئے اور فرمایا:

"بلال رضؓ! تم میں رحم کا مادہ بالکل نہیں؟ آخر تم کم سن لڑکی کو لے کر مقتولین کی لاشوں کے پاس سے کیوں گزر رہے تھے؟"

بلال رضؓ نے یہ سن کر جواب دیا:

"یا رسول اللہ! مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ آپ اس بات کو ناپسند کریں گے میں تو یہ چاہتا تھا کہ یہ لڑکیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مخالفت کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟"

جنگ بدر کے موقعہ پر بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس جنگ کے دوران میں حضرت بلال رضؓ نے امیّہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو حضرت عبد الرحمٰن رضؓ بن عوف کے ساتھ جاتے دیکھا۔ یہ دونوں مکی زندگی میں مسلمانوں کو سخت تکالیف پہنچایا کرتے تھے اور بلال رضؓ کو تو ان کے ہاتھوں سب سے زیادہ مظالم کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جونہی بلال رضؓ کی نظر ان دونوں پر پڑی۔ انھوں نے شور مچا دیا۔ "یہ مشرکین مکہ کا سرغنہ بچ کر جا رہا ہے۔ اگر آج یہ میرے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا تو میں نے کچھ نہ کیا۔" بلال رضؓ کی آواز سن کر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے ان دونوں باپ بیٹوں کو بچانا چاہا لیکن انھیں بچاتے بچاتے وہ خود بھی زخمی ہو گئے مسلمانوں نے تلوار مار کر اس کے بیٹے کو زمین پر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر امیّہ

نے بڑے زور کی ایک چیخ ماری۔ عبدالرحمنؓ بن عوف بالکل بے بس ہو چکے تھے۔ انھوں نے امیہ سے کہا کہ اب میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ تم خود بھاگ کر اپنی جان بچاؤ۔ لیکن مسلمانوں نے اسے بھاگنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور تلواریں مار مار کر اسے بھی وہیں ختم کر دیا۔

تاہم اس واقعہ پر بلالؓ کو موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ امیہ بن خلف اپنی کارستانیوں کی بدولت اسی سزا کا مستحق تھا۔ جب تک مسلمان مکہ میں رہے وہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان پر سخت مظالم ڈھاتا تھا لیکن بزدلی کی یہ حالت تھی کہ جنگ کو نکلتے ہوئے اس کا دم نکلتا تھا۔ جنگِ بدر سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کی پیشگوئی کی تھی۔ جونہی اسے اس پیش گوئی کا علم ہوا۔ اس کا چہرہ خوف کے مارے زرد ہو گیا اور وہ جنگ میں شریک ہونے سے پس و پیش کرنے لگا۔ جب سردارِ لشکر ابو جہل کو امیہ بن خلف کی بزدلی کا علم ہوا تو اس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ وہ چند لوگوں کو ہمراہ لے کر اس کے پاس آیا اور ایک انگیٹھی اس کے حوالے کر کے کہا کہ تم عورتوں کی طرح انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر آگ تاپو۔ اس پر اسے کچھ غیرت آئی اور وہ جنگ کے لیے نکلنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن لڑائی میں بھی اس نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سر انجام نہ دیا۔ کچھ دیر کی معرکہ آزمائی کے بعد جب کفار کے لشکر میں بھگدڑ مچی تو امیہ بن خلف بھاگنے والوں میں آگے آگے تھا۔ اس نے بھاگ کر اپنے عہدِ جاہلیت کے دوست حضرت عبدالرحمنؓ

بن عوف کے پاس پناہ ڈھونڈی۔ جب اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اب میری باری ہے تو اس نے ایسی خوفناک چیخ ماری جو کسی بہادر آدمی کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ کمینہ انسان تھا۔ بے کس، بے بس اور مجبور و لاچار لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں تو اس کا ہاتھ بہت تیز تھا لیکن دُو بدُو مقابلے کے وقت اس کی ساری بہادری ختم ہو جاتی تھی اور وہ انتہا درجہ کا بزدل بن جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے قتل کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بلالؓ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا تھا ؎

هنيئًا زادك الرحمٰن خيرا
لقد أدركت ثأرك يا بلالُ

(بلال! مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمھیں ہر قسم کی بھلائی سے نوازے۔ آخر تم نے اپنا انتقام لے ہی لیا)۔

تاہم یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بلالؓ میں خشونت اور سختی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان مواقع کو چھوڑ کر جہاں نرم دل سے نرم دل آدمی بھی اپنی رحم دلی کو بالائے طاق رکھ کر دشمنوں کے مقابل پر اتر آتا ہے۔ باقی ہر جگہ بلالؓ حد درجہ منکسر المزاجی کا ثبوت دیتے تھے۔ جب کبھی لوگ ان کے صبر و استقامت کا ذکر کرتے اور اسلام کی راہ میں بدترین مظالم ہنسی خوشی برداشت کرنے پر ان کی تعریف کرتے تو وہ کسی قسم کا

اظہارِ تفاخر کرنے کی بجائے سر جھکا لیتے اور کہتے :

"میں تو ایک معمولی آدمی ہوں جو کل تک ادنیٰ غلام تھا۔"

اگرچہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی طویل صحبت نصیب ہوئی تھی کہ شاید کسی اور صحابی کو نصیب نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود ان کی بیان کردہ روایات بہت کم ہیں۔ اور نماز، اذان، افطار اور صوم کے بعض خاص واقعات کے سوا ان سے اور کوئی روایت مروی نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ انھیں یہ بات سخت ناپسند تھی کہ لوگ ان کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھیں اور سر جھکا کر اس طرح ان کی روایات سنیں جس طرح نمازی امام کا خطبہ سنتے ہیں۔

حضرت بلالؓ میں نسلی طور پر دو اور صفات بھی پائی جاتی تھیں ایک فراست نظر اور دوسری آرام طلبی یا بالفاظ دیگر سخت محنت و مشقت سے پہلو تہی۔

ایک مرتبہ ایک شخص ربیعۃ السحیمی کے لڑکے کو مسلمانوں نے قید کر لیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے بیٹے کو رہا کر دینے کی درخواست کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ جا کر سحیمی کو اس کا لڑکا دلا دیں۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ گئے اور لڑکا دلا دیا۔ واپس آ کر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا :

"یا رسول اللہ! میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ باپ بیٹے کے ملاپ کے

وقت دونوں میں سے کسی نے بھی آنسو نہیں بہائے۔ حالانکہ ایسے مواقع پر خوشی کے آنسو نکل آتے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ بدویوں کی سنگ دلی کی ایک علامت ہے۔"

مندرجہ بالا روایت سے بلال کی فراستِ نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ عام انسان اس قسم کے واقعات کو گہری نظر سے نہیں دیکھتا لیکن بلال کی نظر بڑی تیز تھی۔ انھوں نے فوراً بھانپ لیا کہ چونکہ باپ بیٹے نے ملتے وقت کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا اس لیے ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔

آرام طلبی کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ خیبر کے بعد وادی القریٰ کی جانب جا رہے تھے۔ آپ نے بلالؓ کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ آپ کو صبح کی نماز کے لیے جگا دیں۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ بلالؓ کچھ دیر تو جاگتے رہے۔ پھر ان پر نیند نے غلبہ پا لیا اور وہ سو گئے۔ چونکہ تمام لوگوں پر سفر کی تکان غالب تھی اس لیے فجر کے وقت لشکر میں سے کسی کی بھی آنکھ نہ کھلی اور سب غافل پڑے سوتے رہے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی۔ اس وقت سورج نکل آیا تھا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جگایا۔ سب لوگ گھبرا کر اٹھے۔ حضورؐ نے سب کو وضو کرنے کا حکم دیا اور صبح کی نماز اس حالت میں پڑھی گئی کہ لوگوں کی پیشانیوں سے پسینہ بہ رہا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد آپ نے فرمایا:

"ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ خواہ وہ انھیں قبض کرے خواہ ہمیں لوٹا دے۔ اسے ہر طرح کا اختیار ہے۔"

اس کے بعد آپؐ بلالؓ کی طرف متوجّہ ہوئے اور فرمایا:

"بلالؓ! تمھیں کیا ہوا تھا؟ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ میں سب کو نماز کے لئے جگا دوں گا۔"

انھوں نے عرض کیا:

"یا رسُول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ میرے نفس پر بھی اسی ذات نے قابو پا لیا جس نے آپ پر قابو پا لیا تھا۔"

یہ سن کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام مسکرانے لگے اور لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔

حضرت بلالؓ کے ساتھ ایسا واقعہ اگرچہ صرف ایک بار پیش آیا تھا تاہم اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی حد تک آرام طلبی کا مادہ ضرور موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے آپ سے نمازِ فجر چھوٹ گئی اور ان کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو بھی نماز قضا کرنی پڑی۔

حضرت بلالؓ کے متعلق آخری روایت جو ہمیں تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتی ہے اس کا تعلق اس واقعہ سے ہے جب حضرت عمر فاروقؓ نے ابوعبیدہؓ کے ذریعے خالدؓ بن ولید کی جواب طلبی کی تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک شاعر کو ایک قصیدے

کے صلے میں کثیر رقم مرحمت کی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو لکھا کہ وہ مجمع عام میں خالدؓ کو بلا کر ان سے پوچھیں کہ وہ رقم انھوں نے اپنے مال سے دی تھی یا مسلمانوں کے اموال میں سے؟ چنانچہ تعمیل حکم میں حضرت ابوعبیدہؓ نے خالدؓ کو بلایا اور مجمع عام میں ان سے یہ سوال پوچھا۔ خالدؓ چپ رہے۔ اس پر بلالؓ آگے بڑھے۔ خالدؓ کا عمامہ کھول کر اس سے ان کی مشکیں کس لیں اور پوچھا:

"بتاؤ۔ تم نے وہ رقم اپنے مال سے دی تھی یا مسلمانوں کے اموال سے؟"

خالدؓ نے جواب دیا:

"اپنے مال سے۔"

یہ جواب سن کر بلالؓ نے عمامہ گردن سے نکال کر خالدؓ کے سر پہ باندھ دیا اور کہا:

"خالدؓ! برا نہ ماننا ہمیں اپنے حاکموں کی ہر طرح اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اگر دیکھا جائے تو حضرت بلالؓ کے تمام اعمال و افعال ایک محور کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے۔ انھوں نے زندگی میں ایک ہی سبق سیکھا تھا اور وہ یہ کہ اپنے پیشوا اور حاکم کی کامل وفاداری کے ساتھ اطاعت کی جائے اور ذاتی اختلافات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب انھوں نے دیکھا حضرت خالدؓ بن ولید حضرت ابوعبیدہؓ کے سوال کا جواب دینے میں پس و پیش کر رہے ہیں تو ان کی غیرت اور احساس

طبیعت یہ گوارا نہ کرسکی کہ ایک جلیل القدر سپہ سالار برسرِ عام خلیفۃ المسلمین کے سوال کا جواب دینے سے پہلو تہی کرے۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر اس کی مشکیں کس لیں اور یہ خیال نہ کیا کہ وہ ایسے شخص کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں جو اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ تاہم جب خالدؓ نے ان کے سوال کا جواب دے دیا۔ تب ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور اُنھوں نے فوراً عمامہ کھول کر اسی وقت ان کے سر پر باندھ دیا اور ساتھ ہی معذرت بھی کی کہ میں نے کسی ناراضگی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا بلکہ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو اطاعت اور فرمانبرداری کا سبق سکھایا جائے۔

لیکن ان کی اطاعت صرف اسی شخص کے لئے خاص تھی جو دل سے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے احکام کی فرمانبرداری کرتا تھا۔ اپنے کافر آقاؤں کی اطاعت کرنے کا خیال ان کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اُنھوں نے ایسے وقت میں مشرک آقاؤں کی بات سُننے اور ان کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ جب موت ان کی نظروں کے سامنے گردش کر رہی تھی اور انھیں اپنی زندگی کا مطلق یقین نہ رہا تھا اور اس طرح صبر و استقامت کی ایک تابندہ مثال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم کر دی۔

اذان

نماز کی طرف بلانے کے لئے وہی الفاظ مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں جو نماز میں پڑھے جانے والے الفاظ سے مشابہت رکھتے ہوں جنھیں سنتے ہی انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ خدا کے دربار میں اس کی حاضری کا وقت آگیا ہے اور اب اسے کل دنیوی کاروبار چھوڑ کر سب سے بڑے شہنشاہ کے حضور پیش ہونے کی تیاری کرنی چاہیئے اور وہ آواز ایسی ہونی چاہیئے جس میں مخلوق کی جانب سے اپنے پروردگار کے حضور انتہائی خضوع و خشوع کا اظہار کیا گیا ہو اور ابدی حقیقتوں کا اظہار ایسے دلکش الفاظ میں کیا گیا ہو جو بار بار سننے کے باوجود کانوں پر گراں نہ گزریں اور انسان کو ہر بار یہی محسوس ہو کہ وہ ایک انوکھی آواز سن رہا ہے جس سے وہ اس سے قبل بالکل ناآشنا تھا۔

اللہ اکبر! اللہ اکبر!

اذان کے یہ وہ ابتدائی الفاظ ہیں جن کے ذریعے مسلمانوں کو نماز کے لیے بلایا جاتا ہے۔ یہ چند الفاظ بظاہر بہت سادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں اللہ کی عظمت و جبروت کا بیان اس جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر کسی طرح ممکن نہیں۔ ایک حقیقی مسلمان یہ الفاظ سنتے ہی اپنے رب کے دربار میں حاضر ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے اور اس کی نماز درحقیقت اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب اذان کے پُرشوکت الفاظ اس کے کانوں میں پڑتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی ذہن پر جس قدر اذان کے الفاظ اثر کرتے ہیں دنیا کے اور کوئی الفاظ نہیں کرتے۔ بچپن میں ہم اذان سنتے ہیں۔ لیکن اس کے معانی و مطالب سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جونہی اللہ اکبر اللہ اکبر کی دلکش آواز کان میں پڑتی ہے۔ ہم اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں اور ہمارا یہی جی چاہتا ہے کہ یہ رسیلی آواز برابر سنائی دیتی رہے۔

مسلمان تو اذان سے اثر قبول کرتے ہی ہیں۔ غیر مسلم اور یورپین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

ایڈورڈ ولیم لین، جنھوں نے اہلِ مصر کے عادات و اخلاق کے متعلق ایک کتاب تحریر کی ہے، لکھتے ہیں کہ اذان کی ندا بے اختیار انسان کے دل میں اترتی جاتی ہے

خصوصاً رات کے سنّاٹے میں تو اس کا اثر بے پناہ ہوتا ہے۔

ایک فرانسیسی سیاح جیرارڈی نرفال اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ بلادِ مشرق میں جس وقت میں نے پہلی بار مؤذن کی سُریلی اور رسیلی آواز سُنی تو مجھ پر وجد اور سرور کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اپنے گائیڈ سے پُوچھا:

"یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟"

اس نے بتایا "یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔"

میں نے پُوچھا "اس کے بعد کیا کہے گا؟"

اس نے کہا "اس کے بعد وہ یہ کہے گا کہ اے خوابِ غفلت میں سونے والو! اس حیّ و قیوم خدا کی عبادت کی خاطر بیدار ہو جاؤ جو کبھی نہیں سوتا۔"

ایک یورپی مصنّف لافکاڈیو ہیرن LAFACADIO HEARN نے حضرت بلال رضؓ کے متعلق ایک مختصر مقالہ لکھا ہے جس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا ترجمہ آئندہ باب میں درج کیا جائے گا۔ حضرت بلال رضؓ کے ذکر کے ساتھ ہی اس نے اذان کے متعلق بھی چند سطور تحریر کی ہیں جن میں وہ لکھتا ہے۔

"بلادِ اسلامیہ میں سفر کرتے ہوئے اگر کسی مغربی سیاح کو بلند و بالا میناروں والی کسی مسجد کے قُرب و جوار میں رات گزارنے کا اتفاق ہو تو صبح سویرے جب ساری فضا پر کامل سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے، اسے ایک کیف آور اور دلکش آواز سُنائی

دے گی جس کا ایک ایک لفظ اپنے زیر و بم کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جائے گا اور وہ ندا بلند کرنے والے کے سحر انگیز ترنّم سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ یہ وہ آواز ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کو خدائے واحد کی عبادت کے لئے بلایا جاتا ہے۔ یہ ندا صرف طلوعِ آفتاب سے قبل فجر کی سحر آگین فضا ہی میں بلند نہیں ہوتی۔ بلکہ اگلے روز صبح کے نمودار ہونے تک مزید چار مرتبہ سیّاح کے کانوں کو یہ خوشگوار نغمہ سنائی دیتا ہے۔ ایک مرتبہ تابناک دوپہر کے وقت جب ساری فضا سورج کی تند و تیز اور روشن شعاعوں سے منوّر ہو رہی ہوتی ہے۔ دوسری مرتبہ غروب آفتاب سے کچھ عرصہ قبل جب سورج کی قرمزی شعاعوں سے مغرب کی فضا جگمگا رہی ہوتی ہے۔ تیسری مرتبہ غروب آفتاب کے معاً بعد جب شفق کی سرخی سے فضا لالہ زار بنی ہوئی ہوتی ہے اور آخری مرتبہ اس وقت جب ہر طرف رنگ و نور کا ایک سیلاب بہہ رہا ہوتا ہے اور بجلی کے ہزاروں رنگ برنگے قمقموں کی روشنی مسجدوں کے بلند و بالا میناروں اور منقشی گنبدوں پر پڑ کر ان کے حسن کو دوبالا کر رہی ہوتی ہے۔ رات کے آخری حصے میں اذان کی جو ندا اسے سنائی دے گی۔ اس میں بعض نئے الفاظ بھی شامل ہوں گے۔ جن کے متعلق اگر وہ اپنے ترجمان سے دریافت کرے گا تو اسے یقیناً وہی جواب ملے گا جو جیرارڈ دی نرِوال کے ترجمان نے اسے دیا تھا۔ یعنی جناب عالی یہ شخص کہہ رہا ہے۔

"اے خوابِ غفلت میں سونے والو! اس حیّ و قیّوم خدا کی عبادت کی خاطر

بیدار ہو جاؤ جو کبھی نہیں سوتا۔"

اگر ترجمان کو تاریخ اسلام سے بھی کچھ واقفیت ہو گی تو وہ سیاح کو بتائے گا کہ یہ آواز سب سے پہلے صحرائے عرب میں ایک حبشی غلام بلالؓ بن رباحؓ نے بلند کی تھی جسے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خادم خاص ہونے کا شرف حاصل تھا اور آپ نے اس کام کے لئے ہزاروں لوگوں کو چھوڑ کر صرف اس غلام کو مخصوص کیا تھا۔ یہ غلام دمشق کی خاک میں آسودہ ہے اور آج بھی اس کا مزار زیارت گاہِ خواص و عوام اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔"

ہم نے خود بھی اپنی آنکھوں سے غیر ملکی سیاحوں کو اذان کی آواز سے غایت درجہ متاثر ہوتے دیکھا ہے۔ جامع مسجدوں میں عام طور پر خوش الحان لوگ اذان دینے کے فرائض سرانجام دیتے ہیں جس وقت ان کی آواز فضا میں بلند ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک غیبی آواز کانوں میں پڑ کر دل کو برما رہی ہے یا ایک طائرِ خوش نوا اپنی مدھ بھری آواز سے اہلِ مجلس کو مست و بے خود کر رہا ہے۔

اذان کی اثر انگیزی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ

لہ مقالہ نگار کا اشارہ فجر کی اذان کے ان الفاظ کی طرف ہے۔ الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) (مترجم)

مؤذنوں نے رمضان کے مہینے میں رات کے آخری حصے میں میناروں پر سے طبل بجانے شروع کئے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ سحری کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اور وہ کھانا پینا موقوف کر دیں۔ اس پر قریبی ہوٹلوں میں مقیم بعض غیر ملکی سیاحوں نے مقامی باشندوں سے بے آرامی کی شکایت کی اور کہا کہ اذان سے ہمیں قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گہری نیند میں ہم کوئی خوشگوار خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان نقاروں سے جو عین ہمارے سروں پر بجائے جاتے ہیں ہمارے آرام میں بہت خلل پڑتا ہے۔

ابتداء میں مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے کی خاطر طبل بجانے کی تجویز بھی تھی آغازِ اسلام میں اذان کا وجود نہ تھا۔ مسلمان بہت قلیل تعداد میں تھے اور ایک معمولی سی آواز سے گرد و پیش کے مسلمان نماز کے لئے اکٹھے ہو جاتے تھے لیکن ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ پایا اور اسلام نے بھی روز افزوں ترقی کرنی شروع کی تو مسلمانوں نے کوئی ایسا طریقہ سوچنا شروع کیا جس سے دور دور تک پھیلے ہوئے لوگوں کو نماز کے لئے اکٹھا کیا جا سکے۔

طبقات ابن سعد اور بعض دوسری کتب میں اس سلسلہ میں جو روایات درج کی گئی ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اذان کا حکم نازل ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منادی کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے یہ الفاظ کہتا

اَلصَّلوٰۃُ جَامِعَۃٌ (نماز کھڑے ہونے کا وقت قریب آگیا ہے) یہ آواز سن کر لوگ نماز کے لیے مسجد میں جمع ہو جاتے۔ جب قبلہ بیت المقدس سے ہٹا کر خانہ کعبہ کی جانب کر دیا گیا تو مسلمانوں کو اس امر کا احساس پیدا ہوا کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے جس سے دُور دُور کے لوگ بآسانی نماز کے لیے جمع ہو سکیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس غرض کے لیے بگل بجانا چاہیے۔ بعض نے ناقوس بجانے کی صلاح دی۔ بعض نے کہا کہ کسی بلند ٹیلے پر آگ جلا دینی چاہیے لیکن کسی بات پر فیصلہ نہ ہو سکا اور مجلس برخاست ہوگئی۔ ایک صحابی عبداللہ بن زید خزرجی اسی فکر میں غلطاں و پیچاں گھر پہنچے۔ گھر والوں نے کھانے کو پوچھا۔ لیکن انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے لیے لوگوں کو بلانے کے مسئلہ نے پریشان کیا ہوا ہے۔ میں جب تک اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کر لوں گا کھانا نہ کھاؤں گا۔ رات کو سوتے میں انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص سبز کپڑے پہنے ہوئے ان کے پاس سے گزرا جس کے ہاتھ میں ایک ناقوس بھی تھا۔ انھوں نے اس سے پوچھا "یہ ناقوس بیچتے ہو؟" اس نے کہا "تم اس کو کیا کرو گے؟" انھوں نے جواب دیا "میں اسے خرید کر ہر نماز کے وقت بجایا کروں گا تاکہ مسلمان نماز کے لیے اکٹھے ہو سکیں۔" اس نے کہا "میں تمھیں اس سے بھی بہتر ایک چیز بتاتا ہوں۔ تم ناقوس بجانے کی بجائے یہ الفاظ کہا کرو:

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اشہد ان لاالٰہ الاّ اللہ

اشهد ان لا الٰہ الا اللہ۔ اشہد ان محمداً رسول اللہ۔ اشہد ان محمداً رسول اللہ۔ حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح حی علی الفلاح۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ۔

اس شخص نے یہ الفاظ مسجد کی چھت پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہے۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے بیٹھ گیا اور پھر کھڑے ہو کر نماز کی اقامت کہی جو انہی الفاظ پر مشتمل تھی جن الفاظ میں اذان دی گئی تھی۔

عبداللہ بن زید بیدار ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رات والا تمام واقعہ حضورؐ کے گوش گزار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بلالؓ کے پاس جا کر انہیں یہ الفاظ یاد کرا دو اور انہیں کہو کہ وہ ہر نماز کے وقت باواز بلند یہ الفاظ دہرایا کریں۔ جب پہلی بار حضرت بلالؓ کی زبان سے یہ الفاظ نکل کر مدینہ کی فضا میں گونجے تو حضرت عمرؓ بن خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! میں نے بھی آج رات خواب میں ایک شخص کو بعینہٖ یہی الفاظ کہتے سنا ہے۔" اس طرح اذان کا آغاز ہوا۔ حضرت بلالؓ نے صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کے الفاظ زائد کر دیئے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا اور وہ الفاظ آج تک فجر کی اذان کے وقت دہرائے جاتے ہیں۔ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کے الفاظ صرف اس وقت دہرائے جاتے جب نماز کا وقت نہ ہوتا اور مسلمانوں کو

کسی ضروری امر کے متعلق مشورہ کرنے یا کوئی اہم خبر سنانے کے لئے بلانا ہوتا۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اذان دینے کے الفاظ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ شیعہ حیّ علی الصّلوٰۃ اور حیّ علی الفلاح کے ساتھ حیّ علیٰ خیر العمل کے الفاظ زیادہ کہتے ہیں اور مالکی چار تکبیروں کی بجائے صرف دو تکبیریں کہتے ہیں۔ اسی طرح حنبلیوں کے سوا باقی تمام فرقوں کے موذن اس امر کا التزام رکھتے ہیں کہ اذان کے الفاظ خوش الحانی اور ترنم سے ادا کریں تاکہ ان کی آواز لوگوں کے دلوں میں اتر تی چلی جائے اور وہ ذوق و شوق سے نماز میں حاضر ہونے کی تیاری میں مشغول ہو جائیں۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پنج وقتہ اذان دینے کی ذمہ داری بلال رض کے سپرد کی اور لوگوں نے سب سے پہلے انہی کی زبان سے اذان کے الفاظ سنے مسلمانوں میں یہ شرف ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ حضرت بلال رض اس پر جتنا بھی فخر کرتے بجا تھا۔ پھر یہ شرف بھی کچھ کم نہیں کہ حضرت بلال رض اس مسجد کے موذن تھے جس میں خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بنفس نفیس امامت فرمایا کرتے تھے۔

صحابہ کے اقوال سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت بلال رض خوش آواز انسان تھے اور ان کی اذان سے مسلمانوں پر خشوع و خضوع کی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جونہی ان کی آواز فضائے مدینہ میں بلند ہوتی تھی۔ ہر شخص کی زبان

پر بے اختیار درود جاری ہو جاتا تھا اور مدینہ کے ایک ایک متنفس کی زبان
اشھد ان لا الہ الا اللہ اور اشھد ان محمدا رسول اللہ کے ورد
میں مصروف ہو جاتی تھی۔

البتہ فتح مکہ کے متعلق جو روایات مروی ہیں۔ ان میں یہ ذکر ہے کہ مشرکین مکہ
کو بلال رض کی آواز سخت ناپسند تھی اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے یہ سوال
بھی کرتے تھے کہ "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس غلام کے سوا اور کوئی آدمی نہیں
ملا جو کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر ہینکتا ہے۔"

ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص خواہ اس کی حیثیت
قبائل عرب میں کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو۔ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اس کی بے حرمتی
کرنے کا موجب ہوگا۔ کجا یہ کہ ایک غلام بے محابا اس پر چڑھ جائے اور بلند آواز
سے لوگوں کو توحید کا سبق سنائے۔

ان میں سے بعض نے یہ منظر دیکھ کر حارث بن ہشام سے کہا:

"تم دیکھتے ہو کہ یہ غلام کہاں کھڑا ہے ؟"

اس نے حکمت عملی سے کام لیا اور یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ "ان باتوں کو
چھوڑو۔ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوگی تو وہ آپ اس کا سدباب کر دے گا۔"

جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رض کو کعبہ کی چھت پر چڑھ کر
اذان دینے کا حکم دیا۔ حارث بن ہشام، ابو سفیان بن حرب اور عتاب بن اسید

کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے جس وقت بلالؓ کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو عتاب نے کہا:

"اللہ نے اُسید پر بڑا ہی فضل کیا جو اسے آج سے پہلے ہی دُنیا سے اُٹھا لیا اگر وہ آج کے دن یہ الفاظ سُنتا تو ہرگز تاب نہ لا سکتا۔

حارث بن ہشام نے کہا:

"خدا کی قسم! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ محمدؐ واقعی سچے ہیں تو میں ضرور ان کی پیروی اختیار کر لیتا۔"

ابو سفیان بولا:

"میں تو کچھ کہتا نہیں۔ اگر میں کچھ کہوں گا تو یہ کنکریاں جا کر میری بات محمدؐ کو بتا دیں گی۔"

دراصل بات یہ ہے کہ مشرکینِ مکّہ کو مکّہ کی چھت پر چڑھ کر کسی شخص کا وہاں سے ندائے توحید کا بلند کرنا طبعاً سخت ناگوار تھا اور خواہ فرشتہ بھی کیوں نہ ہوتا وہ اس کی آواز کی تاب نہ لا سکتے۔ اُنھوں نے حضرت بلالؓ کے متعلق جو ناگفتہ بہ الفاظ استعمال کیے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اوّل تو عین خانہ کعبہ کی چھت سے توحید کی منادی کی جا رہی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل اسی خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے یہ منادی وہ شخص کر رہا تھا جو ان کی نظروں میں نہایت حقیر و ذلیل تھا اور جس پر قیامِ مکّہ کے دوران میں اُنھوں نے ناقابلِ برداشت مظالم ڈھائے تھے۔

ورنہ بلالؓ کی آواز حقیقتاً مکروہ نہ تھی۔ اگر مکروہ ہوتی تو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جو خود حد درجہ نفاست پسند تھے، انھیں اس اہم خدمت کے لیئے مقرر نہ کرتے۔ مشرکینِ مکّہ کی ناراضی کی اصل وجہ یہی تھی کہ چونکہ بلالؓ جہیرالصوت تھے اور ان کی آواز دُور دُور تک سُنائی دیتی تھی۔ اس لیئے جونہی اُنھوں نے کھڑے ہو کر اذان دی۔ مکّہ کے اکثر حصّے میں ان کی آواز پہنچ گئی اور توحید کی وہ ندا مکّہ کے ہر فرد بشر نے سُن لی۔ جسے دبانے کے لیئے مشرکینِ مکّہ نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا تھا اور جسے بلند کرنے کی پاداش میں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے ساتھیوں سمیت مکّہ سے نکل کر اور دو سو میل دُور جا کر مدینہ میں پناہ لینی پڑی تھی۔

اسلام کا پہلا مؤذّن

خلفاء راشدین اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ان صحابہ کے متعلق جن کی قسمت میں آگے چل کر عظیم الشان سپہ سالار اور جلیل القدر فرمانروا بننا لکھا تھا۔ یورپی زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جن صحابہ نے عام سیاست میں حصّہ نہیں لیا اور جنھیں سلطنت کی طرف سے کوئی ملکی عہدہ تفویض نہیں کیا گیا۔ ان کے متعلق بہت کم مواد ملتا ہے۔ حضرت بلال رضؓ کا شمار بھی مؤخر الذکر طبقہ میں ہوتا ہے۔ اسی لیئے ان کے بارے میں بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ جن معدودے چند یورپیوں نے حضرت بلال رضؓ پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں ایک مشہور ادیب لفکاڈیو ہیرن (LAFCADIE HEARN) بھی شامل ہے۔ جس نے انگریزی زبان میں ایک مقالہ آپ کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اس

شخص نے کچھ عرصہ تک امریکی اخباروں میں کام کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ہندوستان میں گزارا۔ بعدازاں مختلف ایشیائی ملکوں میں پھرتے رہنے کے بعد مستقل طور پر جاپان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ وہیں اس نے شادی بھی کر لی اور اپنے آپ کو ہمہ تن علمی اور ادبی مشاغل کے لئے وقف کر دیا۔ لفکاڈیو ہیرن کا یہ مقالہ اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ قارئین کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ انہیں پتا چل سکے کہ حضرت بلال رض کی پُر خلوص زندگی نے کس طرح بڑے بڑے لوگوں اور فلسفیانہ نظر رکھنے والوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

ہیرن نے اپنے مقالہ کا آغاز ایک انگریز شاعر ایڈون آرنلڈ (EDWIN ARNOLD) کے چند اشعار سے کیا ہے۔ جن میں وہ رب العزت کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اگر کبھی کوئی دن ایسا بھی آ جائے۔ جب یہ دنیا تیرے عبادت گزاروں سے خالی ہو جائے اور روئے زمین کے کسی گوشے سے بھی تیری حمد و ثنا بلند کرنے والوں کی آواز سنائی نہ دے۔ تب بھی اس کارخانۂ عالم میں ہر سو تیری نشانیاں جلوہ گر رہیں گی اور زمین کا چپہ چپہ تیرے وجود کی گواہی دیتا رہے گا۔ آسمان کے تمام سیارے جو رات دن گردش میں لگے رہتے ہیں اور تمام ستارے جن کی ضوفشانی سے عالم بقعۂ نور بنا رہتا ہے۔ یہ تیرے وہ "درویش" ہیں جو محفلِ ذکر میں تیرے عرشِ تاباں کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

ان اشعار کو درج کرنے کے بعد ہیرن لکھتا ہے :

"بلادِ اسلامیہ میں سفر کرتے ہوئے اگر کسی مغربی سیاح کو بلند و بالا میناروں والی کسی مسجد کے قرب و جوار میں رات گزارنے کا اتفاق ہو تو صبح سویرے جب ساری فضا پر کامل سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے اسے ایک کیف آور اور دلکش آواز سنائی دے گی جس کا ایک ایک لفظ اپنے زیر و بم کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جائے گا اور وہ ندا بلند کرنے والے کے سحر انگیز ترنم سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ یہ وہ آواز ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کو خدائے واحد کی عبادت کے لئے بلایا جاتا ہے۔ یہ ندا صرف طلوعِ آفتاب سے قبل فجر کی سحر آگین فضا ہی میں بلند نہیں ہوتی بلکہ اگلے روز صبح کے نمودار ہونے تک مزید چار مرتبہ سیاح کے کانوں کو یہ خوشگوار نغمہ سنائی دیتا ہے۔ ایک مرتبہ تابناک دوپہر کے وقت جب ساری فضا سورج کی تند و تیز اور روشن شعاعوں سے منور ہو رہی ہوتی ہے۔ دوسری مرتبہ غروبِ آفتاب سے کچھ عرصہ قبل جب سورج کی قرمزی شعاعوں سے مغرب کی فضا جگمگا رہی ہوتی ہے۔ تیسری مرتبہ غروبِ آفتاب کے معاً بعد جب شفق کی سرخی سے فضا لالہ زار بنی ہوئی ہوتی ہے اور آخری مرتبہ اس وقت جب ہر طرف رنگ و نور کا ایک سیلاب بہہ رہا ہوتا ہے اور بجلی کے ہزاروں رنگ برنگے قمقموں کی روشنی مسجدوں کے بلند و بالا میناروں اور منقش گنبدوں پر پڑ کر ان کے حسن کو دوبالا کر رہی ہوتی ہے۔ رات

کے آخری حصے میں اذان کی جو ندا اسے سنائی دے گی۔ اس میں بعض نئے الفاظ بھی شامل ہوں گے۔ جن کے متعلق اگر وہ اپنے ترجمان سے دریافت کرے گا تو اسے یقیناً وہی جواب ملے گا جو جیرار دی نرفال کے ترجمان نے اسے دیا تھا۔ یعنی یہ شخص کہہ رہا ہے،

"اے خوابِ غفلت میں سونے والو! اس حیّ و قیوّم خدا کی عبادت کی خاطر بیدار ہو جاؤ جو کبھی نہیں سوتا۔"

اگر ترجمان کو تاریخ اسلام سے بھی کچھ واقفیت ہوگی تو وہ سیّاح کو بتائے گا کہ یہ آواز سب سے پہلے صحرائے عرب میں ایک حبشی غلام بلالؓ بن رباح نے بلند کی تھی جسے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے خادمِ خاص ہونے کا شرف حاصل تھا اور انھوں نے اس کام کے لئے ہزاروں لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسی غلام کو مخصوص کیا تھا۔ یہ غلام دمشق کی خاک میں آسودہ ہے اور آج بھی اس کا مزار زیارت گاہِ خواص و عوام اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

بلالؓ ایک حبشی غلام تھے لیکن اپنی قوتِ یقین، پیغمبرِ اسلام سے عشق و محبت اور اپنی ترنم انگیز آواز کے باعث ان کا نام زندہ جاوید بن چکا ہے جو ندا انھوں نے ریگ زارِ عرب میں بلند کی تھی، بارہ سو سال سے زائد عرصے سے وہی ندا ہر موذّنِ اسلام بلند کرتا چلا آتا ہے۔ آج بھی مراکش کے صحراؤں سے لے کر مشرقِ بعید کے آخری گوشوں تک عالمِ اسلامی کے طول و عرض میں اذان کی جو آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کے

الفاظ بعینہ وہی ہیں جو سب سے پہلے بلالؓ نے اپنی زبان سے ادا کیے تھے۔

مؤذن کے لیے بعض شرائط لازمی سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ قرآن کریم کا حافظ ہو۔ ہر قسم کی آلودگی سے اس کا دامن پاک ہو۔ آواز بلند اور صاف ہو۔ لہجہ فصیح ہو۔ مخارج حروف کو صحیح طور پر ادا کر سکتا ہو۔ ان تمام باتوں کے علاوہ سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ خوش الحان ہو اور اس کی آواز کو سن کر دل کو ایک سرور حاصل ہو۔ فارسی کے مشہور شاعر مصلح الدین سعدی شیرازی نے اپنی کتاب "بوستان" میں بعض پُرلطف حکایتیں درج کی ہیں جن کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اذان کے لیے خوش الحانی کو کس قدر ضروری خیال کرتے ہیں۔

منجملہ دیگر حکایتوں کے اُنھوں نے ایک حکایت یہ بھی درج کی ہے کہ سنجار میں ایک مؤذن بہت کرخت آواز تھا اور ہر شخص اس کی آواز سے تنگ آیا ہوا تھا۔ مسجد کا متولّی بہت نیک دل انسان تھا وہ صاف جواب دے کر مؤذن کے جذبات کو مجروح نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک اور طریقہ استعمال کیا۔ اُس نے ایک روز مؤذن کو بُلا کر کہا کہ تم سے پہلے اس مسجد میں دو مؤذن مقرر تھے۔ جن میں سے ہر ایک کی تنخواہ پانچ درہم تھی۔ وہ لوگ میری منتیں کر رہے ہیں۔ تم یہ کام کرو کہ مجھ سے یہ دس دینار لے لو اور اس مسجد کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ تاکہ ان غریب آدمیوں کے لیے جگہ نکل سکے۔ مؤذن نے یہ شرط قبول کر لی اور دس درہم لے کر کسی اور جگہ چلا گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ متولّی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"آقا! آپ نے مجھے دس دینار دے کر اپنی مسجد میں اذان دینے سے محروم کر دیا۔ میں دُوسری جگہ گیا تو وہاں کے لوگوں نے مجھ سے کہا۔ اگر میں ان کی مسجد چھوڑ دوں تو وہ مجھے بیس دینار حق خدمت کے طور پر دے دیں گے۔ لیکن میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور اذان ترک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

یہ سُن کر متولی مسکرایا اور کہنے لگا کہ اگر تم نے وہاں رہنے پر اصرار کیا اور کسی بھی دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا تو وہ لوگ تم سے چھٹکارا پانے کے لیے پچاس درہم بھی خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔"

اسی قبیل کی ایک اور حکایت بھی شیخ سعدی نے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک حافظ بہت کرخت آواز سے تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کوئی شخص اس کے پاس سے گزرا اور پوچھا "تمھیں تلاوت کے بدلے کیا تنخواہ ملتی ہے؟" حافظ نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں"۔ اس شخص نے پوچھا "تو پھر یہ مفت کی محنت و مشقت کیوں برداشت کرتے ہو؟" حافظ نے کہا "محض خدا کی خاطر"۔ اس شخص نے کہا "اگر تمھیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدِّ نظر ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ تم تلاوت کرنا چھوڑ دو۔"

بلال رضؓ نے اپنی زندگی ایک غلام کی حیثیت سے گزارنی شروع کی۔ کیونکہ وہ ایک حبشی لونڈی کے بطن سے تھے۔ ان کے زمانۂ طفولیت کے متعلق ہمیں بہت کم مواد ملتا ہے۔ سر ولیم میور نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے

چہرے کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ بال گھنے تھے۔ چہرے کی علامات سے اُن کا حبشی ہونا صاف معلوم ہو جاتا تھا۔ قد بہت لمبا تھا۔ جسم گٹھیلا تھا اور اعصاب مضبوط تھے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ابتدائی دعوت کا مکّہ کے غلاموں پر گہرا اثر ہوا کیونکہ اس بے کس مخلوق نے جو غلامی کے بندھنوں میں بُری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ نبی عربی کی تعلیم میں اپنے لئے تسلی کا ویسا ہی سامان پایا جیسا ایک مجروح کو مرہم کے ذریعے ملتا ہے۔

بلالؓ اپنے اہل وطن میں سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ اسی لئے نبی عربیؐ نے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ حبشہ کا پہلا ثمرہ ہیں۔ توحید کا سبق بلالؓ نے غالباً لاشعوری طور پر بچپن میں اپنی والدہ سے سیکھا ہوگا۔ کیونکہ چوتھی صدی عیسوی میں حبشہ میں دین مسیحی کی تعلیمات پر توحید کا رنگ غالب تھا۔ انہی تعلیمات کا اثر بلالؓ میں اپنی والدہ کے ذریعے سرایت کر گیا اور اُنھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسلام قبول کر لیا۔

مکّہ میں مشرکین کے مظالم کا سب سے زیادہ نشانہ یہ غریب و بیکس غلام ہی بنتے تھے۔ عربوں کی قدیم سے یہ عادت چلی آرہی تھی کہ وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کی بدل و جان حفاظت کرتے تھے۔ وہ جان پر کھیل جاتے تھے۔ مگر جس کی حفاظت کا ذمہ لے لیتے تھے۔ اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ جو شخص اپنے کسی حریف کو قتل کر ڈالتا تھا۔ وہ اس کے عزیزوں کے انتقام سے شاذ و نادر ہی بچتا تھا۔ بعض اوقات تو ایک فرد کے قتل پر دو قبیلوں میں حرب و پیکار کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہو جاتا تھا اور نسلوں کی

نسلیں ان جنگوں میں کام آجاتی تھیں۔ اسی لئے محمدؐ اور ان کے وہ ساتھی جو غلامی کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے نہ تھے بلکہ عرب کے آزاد قبائل سے تعلق رکھتے تھے کسی حد تک ظلم و تشدد سے بچے ہوئے تھے۔ کیونکہ انھیں اپنے اپنے قبیلے کی حمایت حاصل تھی لیکن غریب غلاموں کا کوئی بھی حامی و مددگار نہ تھا۔ اس لئے انھیں ہر قسم کے روح فرسا مظالم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ شدید گرمی کے موسم میں جب ہر طرف آگ برس رہی ہوتی تھی انھیں ننگا کرکے تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا تھا۔ ان کے سینوں پر بھاری پتھر رکھے جاتے تھے۔ انھیں مکہ کی پتھریلی زمین پر گھسیٹا جاتا تھا اور اس طرح محمدؐ اور ان کے لائے ہوئے دین کو برا بھلا کہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ان مظالم کی تاب نہ لاکر اکثر غلام وہ الفاظ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے جو ان کے ظالم آقا ان کی زبانوں سے کہلوانا چاہتے تھے۔

انھیں اپنے قول کا یقین دلانے کے لیئے لات اور عزیٰ کی قسم بھی کھانی پڑتی تھی۔ ان کی زبانوں سے تو بے شک اپنے نبی کی شان میں مجبوراً بعض ناز یبا اور ناروا الفاظ نکل جاتے تھے لیکن ان کے دل بدستور عقیدۂ توحید پر قائم رہتے تھے اور ایسا کرتے ہوئے ان کی آنکھیں ندامت کے آنسو بہا رہی ہوتی تھیں۔ تاہم رسول اللہؐ نے یہ کہہ کر ایسے مجبور و معذور لوگوں کو کامل اطمینان دلا دیا کہ اگر وہ اپنے عقیدے پر بصدق دل قائم ہیں تو ان کے ایمان کو کوئی خطرہ نہیں۔ قرآن میں بھی ایسے لوگوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِآیَاتِ اللّٰہِ وَاُولٰئِکَ هُمُ الْکَاذِبُوْنَ ۔ مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ

مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ وَلٰکِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (نحل رکوع ۱۴)

(ترجمہ) "جھوٹ وہی لوگ باندھا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نشانوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور یہی لوگ پکے جھوٹے ہوتے ہیں۔ جو لوگ بھی اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا انکار کریں سوائے ان کے جنھیں کفر پر مجبور کیا گیا ہو لیکن ان کا دل ایمان پر مطمئن ہو وہ گرفت میں نہ آئیں گے ہاں وہ جنہوں نے اپنا سینہ کفر کے لئے کھول دیا ہو۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بڑا بھاری عذاب مقرر ہے۔"

اس دورِ ابتلا میں بلال پوری ثابت قدمی کے ساتھ اسلام پر قائم رہے اور اپنی زبان سے بھی اس قسم کا کوئی لفظ نہیں نکالا جس سے رسول اللہ کی ہتک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ کوڑوں کی مار۔ آگ کی جلن۔ بھوک اور پیاس کی شدت اس مرد وفا سرشت کو اپنے عقیدے سے نہ ہٹا سکیں اور کسی قسم کا ظلم و ستم اس آہنی عزم رکھنے والے انسان کو اسلام سے برگشتہ نہ کر سکا۔ مشرکین مکہ کی ایذا رسانی کے جواب میں اس کی زبان سے صرف اَحَدْ اَحَدْ کے الفاظ نکلتے تھے یعنی خدا صرف ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

بلال کی اس ثابت قدمی کا ذکر مشہور فارسی شاعر فریدالدین عطار نے اپنی کتاب "منطق الطیر" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"بلال کے کمزور جسم پر لکڑیاں اور کوڑے اس شدت سے برستے تھے کہ ان کی کھال

پھٹ جاتی تھی اور زخموں سے خون جاری ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ عقیدۂ توحید کی برملا اشاعت سے باز نہ آتے تھے۔"

ایک دن کا ماجرا ہے۔ یہ حبشی غلام حسب معمول اپنے آقا کے ہاتھوں مار کھا رہا تھا کہ وہاں سے ایک نحیف و نزار، پست قامت، لیکن کشادہ رو اور خوبصورت نقش و نگار والا ایک شخص گزرا۔

یہ نحیف و نزار شخص مکہ کے مشہور تاجر عبداللہ بن عثمان ابی قحافہ تھے جنھیں اسلامی تاریخ میں ابوبکر صدیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ رسول اللہ کے بہت گہرے دوست اور ہجرت کے وقت ان کے ساتھی تھے۔ اس ہجرت کے موقعہ پر ان دونوں نے ایک غار میں پناہ لی تھی۔ اسلامی روایات میں آتا ہے کہ جب یہ دونوں غار میں داخل ہوئے تو مکڑی نے اس کے منہ پر جالا تن دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تعاقب کرنے والے غار تک پہنچے تو منہ پر جالا تنا ہوا دیکھ کر وہیں رک گئے اور اندر داخل نہ ہوئے کیونکہ انھیں خیال ہوا کہ اگر کوئی شخص اندر جاتا تو یہ جالا ٹوٹ جاتا۔ ابوبکرؓ، عائشہؓ کے والد تھے جنھیں رسول اللہ کی زوجیت میں آنے کا شرف حاصل ہوا۔ خود ابوبکرؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ رسول اللہؐ کی وفات پر وہ آپ کے سب سے پہلے خلیفہ بنے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں وہ بہت مالدار تھے۔ چونکہ وہ حد درجہ رقیق القلب تھے اس لئے غلاموں کی بیکسی ان سے نہ دیکھی جاتی تھی اور وہ اپنے اموال کا بیشتر حصہ غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ انھوں نے تقریباً چالیس ہزار درہم ایسے غلاموں کو خریدنے میں صرف کئے۔ جنھیں ان کے مالک اسلام

لانے کی پاداش میں شدید مظالم کا نشانہ بنائے جاتے رہتے تھے۔ ان میں اکثریت کمزور اور ضعیف غلاموں اور لونڈیوں کی تھی۔ ان کے والد ابو قحافہ عورتوں اور کمزور ضعیف غلاموں کو خریدنے پر ناراض ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر تمہیں غلام خریدنے ہی ہیں تو ایسے مضبوط و توانا آدمیوں کو خریدا کرو جو تمہارے کام آئیں اور ضرورت کے وقت تمہاری مدد اور حفاظت کریں۔ لیکن ابو بکرؓ جواب دیتے "ابا جان! میں انہیں اپنی کسی ذاتی ضرورت کے لیے نہیں بلکہ محض خدا کے لئے خریدتا ہوں اور میری نیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں خرید کر آزاد کر دوں۔"

کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ اس سخی اور فیاض انسان کی جس نے ہزاروں درہم غلاموں کو آزاد کرنے میں خرچ کر دیئے، اپنی حالت یہ تھی کہ وہ بکریوں کے بالوں کے بنے ہوئے موٹے اور کھردرے کپڑے پہن کر زندگی گزارتا تھا۔

ابو بکرؓ نے جب بلالؓ کو شدید مظالم کا مسلسل نشانہ بنتے دیکھا تو وہ نہ رہ سکے اور انھوں نے ان کے مالکوں اُمیہ بن خلف اور ابی بن خلف سے سودا کیا اور ایک عبا اور دس دینار کے بدلے انھیں خرید لیا۔

کس شخص کو یہ معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اُمیہ اور اُس کا لڑکا اپنے اس غلام سے عفو اور رحم کے طلب گار ہوں گے جس پر وہ آج جی بھر کر ظلم توڑ رہے ہیں مگر ان کی درخواست قبول نہ ہوگی۔ دس برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ دن آگیا اور معرکۂ بدر میں یہ دونوں بلالؓ کے ہاتھوں مارے گئے۔

بلالؓ فی الحقیقت پہلے کارآمد اور توانا غلام تھے جنھیں ابوبکرؓ صدیق نے خرید کر خدا کی راہ میں آزاد کیا۔ وہ بہت مضبوط جسم کے انسان تھے اور ان کے ظالم آقا اسی لیے ان سے بہت کام لیا کرتے تھے۔

ابوبکرؓ محض خدا کی رضا کی خاطر غلاموں کو آزاد کیا کرتے تھے مگر کہنے والوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے؟ انھوں نے انھیں بدنام کرنے کی خاطر یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ ابوبکرؓ محض اپنے ذاتی فائدے کی خاطر ان غلاموں کو خریدتے ہیں۔ لوگوں کے اسی قول کا ذکر قرآن کی سورۃ اللیل میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ۔ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ۔ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ۔ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ۔ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ۔ وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ۔ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ۔ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ۔ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ۔ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ۔ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ۔ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ۔ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى۔ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ۔ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ۔ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ۔ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ۔

(ترجمہ) میں رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں جب وہ ڈھانک لے اور دن کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں جب وہ خوب روشن ہو جائے اور نر اور مادہ کی پیدائش کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں کہ تمہاری کوششیں یقیناً مختلف ہیں۔ پس جس نے خدا کی راہ میں دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور

نیک بات کی تصدیق کی تو اسے ہم ضرور آسانی کے مواقع بہم پہنچائیں گے اور ایسا شخص جس نے بخل سے کام لیا۔ اور بے پروائی کا اظہار کیا اور نیک بات کو جھٹلایا اسے ہم تکلیف کا سامان بہم پہنچائیں گے اور جب وہ ہلاک ہو گا تو اس کا مال اسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا۔ ہدایت دینا یقیناً ہمارے ہی ذمہ ہے اور ہر بات کی انتہاء اور ابتداء بھی یقیناً ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ پس یاد رکھو کہ میں نے تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ہوشیار کر دیا۔ اس میں سوائے کسی بڑے بدبخت کے کوئی داخل نہ ہو گا۔ ایسا بدبخت جس نے حق کو جھٹلایا اور سچ سے منہ پھیر لیا۔ اور جو بڑا متقی ہو گا وہ ضرور اس سے دُور رکھا جائے گا۔ ایسا متقی جو اپنا مال اس لئے خدا کی راہ میں دیتا ہے کہ اس سے نفس کی پاکیزگی حاصل کرے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہوا جس کا بدلہ اتارنے کا اس کو خیال ہو۔ ہاں مگر اپنے عالیشان رب کی خوشنودی حاصل کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے اور وہ (یعنی خدا) ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔"

آزادی حاصل کرنے کے بعد بلال رضی اللہ عنہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص رازدار خادم بن گئے اور تبلیغ اسلام کی کوششوں میں آپ کے شانہ بشانہ کام کرتے رہے۔

بعض روایات میں ذکر ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد ایک مرتبہ مکہ واپس آئے۔ قریش مکہ کی نظر جونہی ان پر پڑی انہوں نے انہیں قید کر لیا اور سخت تکالیف دیں لیکن یہ روایت ناقابلِ اعتماد ہے اور تاریخ اسلام کی ثقہ کتابوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ہجرت کے بعد وہ صرف رسول اللہ کے ہمراہ ہی مکہ آئے اس سے پہلے نہیں۔ جس ہجرت کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ ہجرت مدینہ تھی جو رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں نے مکہ سے کی اور قریش کے مظالم سے بچنے کے لئے مدینہ میں جا کر پناہ لی۔ مدینہ کی جانب ہجرت کرنے میں بلال رضی اللہ عنہ

بھی دیگر مسلمانوں کے ساتھ تھے۔ وہاں ہم بلالؓ کو اسلام کے پہلے مؤذن کی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔

اسلامی دعوت کے آغاز میں لوگ اذان کے نام سے نا آشنا تھے کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کے مکانات بھی رسول اللہ کے مکان کے قریب ہی تھے اس لئے وہ بہت آسانی سے نماز کے لئے اکٹھے ہو سکتے تھے۔ اس وقت ایک شخص کھڑے ہو کر بلند آواز سے صرف الصَّلوٰۃُ جامِعَۃٌ کے الفاظ کہہ دیتا تھا اور لوگ نماز کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ ہجرت کے بعد بھی مسجد نبوی کی تعمیر اور تحویل قبلہ تک باقاعدہ اذان دینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

اذان کا خیال کیسے پیدا ہوا؟ یہ ایک عجیب واقعہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ مسجد نبوی کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ کو خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو نماز کے لئے بلانے کا موجودہ طریقہ موجودہ حالات کے مناسب نہیں کیونکہ وہ اس جاہ و جلال سے خالی ہے جو اجتماعی عبادات کی طرف بلانے کے لئے اختیار کیا جانا چاہیے۔

پہلے تو رسول اللہ کی یہ رائے ہوئی کہ نماز کے وقت بوق (بگل) سے کام لیا جائے لیکن بعد میں آپ نے یہ ارادہ تبدیل کر دیا کیونکہ بوق بجانے کا رواج یہودیوں کے ہاں تھا اور آپ نہ چاہتے تھے کہ تحویل قبلہ کے بعد یہودیوں کی کسی چیز کو اختیار کریں۔

اس کے بعد آپ کا خیال ناقوس (گھڑیال) کی طرف گیا لیکن اس وقت مدینہ میں ایسا کوئی کاریگر نہ تھا جو ناقوس تیار کر سکتا۔

دریں اثناء مدینہ کے ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ اسے چاندنی رات میں اپنے گھر کے قریب ایک دراز قد شخص ملا جو سبز کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت گھڑیال (ناقوس) تھا۔ وہ شخص اس کے پاس گیا اور گھڑیال خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ مسکرایا اور پوچھا "تم یہ گھڑیال کیوں خریدنا چاہتے ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خریدنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اسے نماز کے وقت لوگوں کو بلانے کے لئے استعمال کر سکیں۔"

دراز قد شخص نے کہا "میں تمہیں اس سلسلے میں ایک بہترین مشورہ دیتا ہوں اور وہ یہ کہ گھڑیال بجانے کی بجائے کوئی شخص مسجد کی چھت پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے لوگوں کو نماز کے لئے بلایا کرے۔ یہ کہہ کر اس شخص نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور بڑی خوش الحانی اور ترنم کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ کہے جو آج بھی افریقہ کے ساحلوں سے لے کر ہندوستان تک ہر اسلامی بستی میں دن میں پانچ وقت سنائی دیتے ہیں۔

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ۔
اشھد ان لا الہ الا اللہ۔ اشھد ان محمدا رسول اللہ۔ اشھد ان محمدا رسول اللہ
حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح۔ حی علی الفلاح۔
اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔

(ترجمہ) اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ آؤ نماز کی طرف۔ دوڑو کامیابی کی طرف۔ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

وہ شخص جب بیدار ہوا تو یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ فوراً ہی رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچا اور اپنا خواب بیان کیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے وفادار اور مخلص خادم بلالؓ کو بلایا اور انھیں حکم دیا کہ وہ ہر نماز کے وقت مسجد کی چھت پر چڑھ کر ان الفاظ کو جو مردِ صالح نے خواب میں سنے ہیں باآوازِ بلند دہرایا کریں۔ رات کا آخری حصہ تھا۔ تعمیلِ حکم میں بلالؓ مسجد کی چھت پر چڑھے اور اپنی مخصوص مترنم آواز میں لوگوں کو نماز کے لئے مسجد میں جمع ہونے کی دعوت دینے لگے۔ نیم خوابیدہ لوگوں کے کانوں میں جونہی بلالؓ کی سحر انگیز اور دلکش آواز پڑی تو وہ حیران ہو کر بستروں سے اٹھے اور جلدی جلدی نماز کی تیاری کر کے مسجد میں پہنچ گئے۔ آج بھی بلادِ اسلامیہ میں ہر جگہ مسجدوں میں بڑے خوبصورت مینارے نظر آتے ہیں۔ جن پر دن میں پانچ وقت موذن چڑھ کر اذان دیتے ہیں ان میناروں کا تخیل دراصل آج سے بارہ سو سال قبل اسی وقت سے پیدا ہوا جب بلالؓ نے مسجد کی چھت پر چڑھ کر اذان کی ندا فضائے مدینہ میں بلند کی تھی۔

بارہ سو سال کے اس طویل عرصے میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب عالمِ اسلامی

کے کسی بھی گوشے سے اذان کی آواز آنی بند ہوئی ہو۔ اذان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہر بستی کے لوگوں کو اوقات کا صحیح پتا چل جاتا ہے اور وہ اپنے کاموں کو ان اوقات کے مطابق با آسانی تقسیم کر سکتے ہیں۔

اذان کی آواز سنتے ہی مسلمان خدائے واحد کی عبادت کے لئے اس طرح دیوانہ وار مسجدوں میں کھنچے چلے آتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو عبادت کے لئے مسجدوں میں پہنچنے کی یہ بے قراری مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ بھی ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ چنگیز خاں کے حملے کے وقت نیشاپور کے مسلمانوں پر یہی کچھ گزرا اور اسلامی تاریخ میں پہلی بار لوگوں کو پتا چلا کہ اذان کو دھوکہ دہی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۶۱۸ھ کا ذکر ہے۔ چنگیز خاں کی فوجوں نے نیشاپور پر حملہ کیا۔ چنگیز خاں کا نام ہلاکت اور تباہی مچانے میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ خونریزی اور سفاکی میں اس کا جواب نہیں۔ اس کی عادت تھی کہ کسی شہر پر ایک بار فوج کشی کے بعد وہاں سے لوٹ آتا۔ اور کچھ عرصے کے بعد جب اہلِ شہر اپنے اپنے گھروں میں واپس پہنچ کر اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتے تو ان پر بے خبری کی حالت میں دوبارہ ٹوٹ پڑتا۔ اس طرح جو لوگ پہلے حملے کے وقت لقمۂ اجل بننے سے رہ گئے ہوتے تھے۔ دوسرے حملے کے وقت با آسانی قابو میں آ جاتے تھے اور چنگیز خانی فوجیں آناً فاناً ان کا کام تمام کر دیتی تھیں۔ حسبِ معمول جب اس نے نیشاپور کو دوبارہ اپنے حملے کا نشانہ بنایا تو اہلِ شہر کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے لوگوں کو مسجدوں میں جا کر اذان کہنے کا حکم دیا۔

جونہی شہر میں اللہ اکبر کی ندا بلند ہوئی لوگ جوق در جوق مسجدوں میں جمع ہونے لگے چنگیز خاں کی فوجیں پہلے ہی سے گھات میں تھیں۔ انھوں نے ایک ایک نمازی کو چن چن کر تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

اذان کا تعلق بہت حد تک موسیقی کے نغمات سے ہے۔ بلال رضؓ ایک حبشی غلام تھے اور حبشی غلاموں کے متعلق یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ عربوں سے زیادہ علم موسیقی کے ماہر ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ نے اپنے عرب صحابہ کو چھوڑ کر ایک حبشی غلام کو اذان دینے کی خدمت تفویض کی تھی کیونکہ اس کی آواز میں وہ ترنم اور سوز پایا جاتا تھا جس سے اہل عرب محروم تھے۔

عربی ادب کی تاریخوں میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ سیاہ فام غلاموں اور لونڈیوں کی آوازوں میں بالعموم وہ سوز ہوتا تھا کہ آدمی سن کر مسحور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ہارون رشید کے زمانے میں اسماعیل بن جامع نے جو خود بہت بڑا مغنی تھا۔ چار درہم دے کر کسی حبشی لونڈی سے ایک نیا راگ سیکھا۔ وہی راگ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو جا کر سنایا۔ وہ اس کے سحر انگیز ترنم سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسے چار ہزار دینار نقد اور بیش قیمت سامان سے بھرا ہوا ایک مکان انعام کے طور پہ دیا۔

شیخ سعدی نے بھی اپنی کتاب "بوستان" میں بعض ایسے چشم دید واقعات درج کئے ہیں جن سے حبشی غلاموں کی علم موسیقی میں کمال درجہ مہارت کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے

لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں بعض لوگوں کے ساتھ حجاز جا رہا تھا۔ وہ لوگ راستہ بآسانی طے کرنے کے لیے بعض صوفیاء کے اشعار گاتے جاتے تھے۔ البتہ ان میں ایک شخص بہت خشک مزاج تھا۔ نہ اسے گانے سے کوئی دلچسپی تھی نہ متصوفانہ اشعار سے۔ جب ہم بنی ہلال کے نخلستان میں پہنچے تو ایک بدو عرب کے خیمے میں ہمیں ایک سیاہ فام غلام دکھائی دیا۔ جو ایسے پُرسوز لہجے میں کچھ اشعار پڑھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا گویا آسمان کی کھڑکی کھل گئی ہے اور جنت کا کوئی پرندہ رسیلے سے نغمے سنا سنا کر عالم پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری کر رہا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ مذکورہ بالا شخص پر غلام کی اس سحر انگیز آواز کا بھی کوئی اثر نہ دکھائی دیتا تھا۔ ابھی غلام گا ہی رہا تھا کہ ہم نے دیکھا۔ اس شخص کے اونٹ نے اپنا کجاوہ زمین پر اُلٹ دیا اور صحرا کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے چلا کر اس سے کہا "تجھ پر ہزار افسوس! ایک وحشی اور بے زبان جانور تو اس غلام کی آواز سے بے خود ہو گیا اور نکیل تڑا کر بھاگ نکلا مگر تو انسان ہو کر ٹس سے مس نہ ہو سکا۔"

مولانا جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کے حدی خوان سالم نے ایک مرتبہ اثنائے سفر میں اپنی لے سے خلیفہ کو اتنا مسحور کیا کہ وہ اونٹ پر سے گرنے سے بال بال بچا۔ اُس نے خوش ہو کر اسے نصف درہم انعام دیا۔ سالم نے کہا "آپ نے مجھے صرف نصف درہم انعام دیا ہے۔ میں نے اپنی حدی خوانی کا نمونہ اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے سامنے بھی پیش کیا تھا جس پر اُس نے مجھے دس ہزار درہم بطور انعام دیئے تھے۔

غرضیکہ جاہلیت اور اسلام کے صدر اوّل میں مغنیوں کی اکثریت غلاموں یا غلاموں کی اولاد پر مشتمل ہوتی تھی۔ کیونکہ قدرت کی طرف سے اُنھیں لحنِ داؤدی عطا ہوتا تھا اور یہ لوگ موسیقی کی دھنوں کے ماہر ہوتے تھے۔ بلال رضی بھی حبشی غلام تھے اور دوسرے غلاموں کی طرح ان کی آواز بھی یقیناً رسیلی ہوگی۔ اسی لئے انھیں اذان دینے کی خدمت تفویض کی گئی۔ البتہ ایک امر تصفیہ طلب ہے اور وہ یہ کہ آیا اذان کی طرز (جسے بعد کے مؤذنوں نے بھی اختیار کیا) خاص بلال رض کی ایجاد کردہ تھی یا رسول اللہ کی طرف سے انھیں اسی طرح کہنے کا حکم دیا گیا تھا؟

اس سلسلے میں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قدیم عربوں میں اگرچہ موسیقی کی حس تو ضرور تھی۔ لیکن وہ بذاتِ خود اس فن کے رموز و اعلام سے ناواقف تھے۔ موسیقی کو حسن کر داد تو ضرور دیتے تھے۔ لیکن خود ادائیگی سے قاصر تھے۔ چونکہ بلال رض غلام تھے، اور اُنھوں نے اپنی غلامی کے زمانے میں اونٹ بھی چرائے تھے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ وہ علم موسیقی اور حدی خوانی سے واقف نہ ہوں۔ اس لئے یہی امر قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت عبداللہ بن زید خزرجی نے رسول اللہ کو اپنا خواب آکر سنایا اور رسول اللہ نے بلال رض کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ مسجد کی چھت پر چڑھ کر اذان کے الفاظ باوازِ بلند اہلِ مدینہ کو سنائیں تو اُنھوں نے علم موسیقی سے طبعی مناسبت کے باعث اذان کے الفاظ ایک خاص ترنّم کے ساتھ ادا کئے جسے رسول اللہ نے بھی پسند فرمایا اور اُس لَے کو اسی طرح برقرار رکھا جس طرح صبح کی نماز کے وقت بلال رض کی زبان سے الصلوٰۃ خیر من النوم کے

الفاظ سُن کر انھیں برقرار رکھا تھا۔ یہ امر ہرگز قرین قیاس نہیں کہ عبداللہؓ بن زید نے خواب میں اذان کی کوئی خاص لے سُنی ہو اور آنکھ کھل جانے پر انھوں نے رسُول اللہ کے سامنے بعینہٖ اسی سُر میں اذان کے الفاظ دہرائے ہوں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں عرب اس فن سے ناواقف تھے اور موسیقی کی دُھنیں سُن کر بھی انھیں اپنی زبان سے ادا کرنے سے قاصر تھے۔

بلالؓ، رسُول اللہ کے آخری وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ صبح کی نماز کے بعد وہ آپؐ کے دروازے پر جاتے اور قرآن کی کوئی آیت پڑھ کر آپؐ کو جگاتے۔ جب نمازی مسجد میں جمع ہو جاتے تو سب لوگوں کی نظریں اس حبشی کی طرف لگی رہتیں جو پہلی صف میں رسُول اللہ کے بالکل پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ جونہی وہ تکبیر کہتا رسُولؐ اللہ نماز شروع کر دیتے۔ اسلام کی قوت و شوکت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بلالؓ کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور اذان دینے کے علاوہ اور بھی کئی اہم کام ان کے سپرد کر دئے گئے۔ وہ رسُولؐ اللہ کے گھر کے منتظم تھے۔ زکوٰۃ اور صدقات کا جو مال آتا تھا وہ بھی بلالؓ ہی کی تحویل میں رہتا تھا فتح مکہ کے موقع پر جب رسُولؐ اللہ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کے سامنے پہنچے تو آپؐ نے کلید بردار سے کنجیاں لے کر بلالؓ کے حوالے کیں اور انھیں خانہ کعبہ کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا شرف بھی جس شخص کو حاصل ہوا وہ بلالؓ ہی تھے۔ اپنے آقا سے محبت اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ سفر ہو یا حضر وہ برابر ان کے

ساتھ رہتے تھے اور گرمی کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی کپڑے سے برابر ان پر سایہ کئے رہتے تھے
محمد (م) کی وفات کے بعد اس بلبل خوش نوا کی آواز سنائی دینی بند ہو گئی اور بلال رض کی جگہ دوسرے
مؤذن مسلمانوں کو نماز کی دعوت دینے کا فریضہ سرانجام دینے لگے کیونکہ بلال رض نے یہ عہد کر لیا
تھا کہ وہ اپنے پیارے آقا کے بعد اور کسی امام کی خاطر اذان نہ دیں گے۔

ہمیں علم نہیں کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد بلال رض نے ابوبکر رض کی صحبت میں کتنا وقت گزارا
تاہم اس حقیقت میں کسی کو شبہ نہیں کہ مدینے میں ان کی جو قدر و منزلت تھی وہ بہت کم لوگوں کو
حاصل تھی۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک عربی خاندان
میں اپنے بھائی ابورویحہ رض کے لیے پیغام دیا۔ عربوں کو اپنے حسب و نسب پر جو غرور ہوتا ہے وہ
محتاجِ بیان نہیں۔ وہ اپنی لڑکی کا رشتہ کسی غلام خاندان میں کرنے کا وہم بھی نہیں کر سکتے لیکن
اس کے باوجود بلال رض کی ان کے دلوں میں اتنی قدر و منزلت تھی کہ انھوں نے بلا تامل اپنی لڑکی
کا نکاح بلال رض کے بھائی سے کر دیا اور حسب و نسب کی ذرا پروا نہ کی۔

بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ خلیفہ اول کے بعد بلال رض کو بعض ملکی امور تفویض کیے
گئے تھے چنانچہ عمر رض بن خطاب نے ــــ جن کا نام عدل و انصاف کے بارے میں ضرب المثل
بن چکا ہے ــــ خالد رض بن ولید سیف اللہ سے ان کی بعض فروگزاشتوں اور غلطیوں کے بارے
میں باز پرس کی تو بلال رض ہی تھے جنھوں نے بھری مجلس میں خالد رض کے سر سے عمامہ اتار کر اسی عمامے
سے ان کے ہاتھ باندھ دیئے اور جب تک انھوں نے امیر المومنین کے سوالات کے جوابات
نہ دے دیے ہاتھ نہ کھولے۔

البتہ اس واقعہ کے بعد بلالؓ کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات کتب تاریخ سے معلوم نہیں ہوتی۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ شام میں لڑنے والی اسلامی فوجوں کے ساتھ جہاد میں مصروف رہتے تھے۔ آخری عمر میں اُنھوں نے پبلک لائف سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی اور دمشق کے مضافات میں زمین کا ایک ٹکڑا لے کر تنہائی اور خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔

بڑے بڑے صحابہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ابوبکرؓ، خالدؓ اور دوسرے مجاہدینِ اسلام جنھوں نے ابتدائی عہد میں اسلام کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دی تھیں، دوسری دُنیا میں اپنے آقا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اب اسلامی سلطنت کے جملہ امور زیادہ تر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے جنھوں نے نبیِ عربیؐ کا زمانہ نہ پایا تھا۔ فتوحات کی وسعت کے باعث مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا سونے کا دریا ہے جو مدینہ کی جانب بہتا چلا آرہا ہے۔ نئی نسل میں چونکہ وہ صلاحیتیں مفقود تھیں جن سے پیشرو بہرہ ور تھے، اس لئے اُنھوں نے بدوی سادگی کو چھوڑ کر جو اہلِ عرب کا طرۂ امتیاز تھی، عیش و عشرت کی زندگی کو اپنا لیا۔ حضرت عمرؓ جو ایک نہایت ہی بالغ نظر حکمران تھے۔ ان تمام حالات کو گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ بسا اوقات ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے کہ کہیں مال و دولت کی فراوانی کے باعث امت کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو جائے اور لوگوں میں حسد اور دشمنی کے جذبات اُبھر کر ملک کے امن و چین کو غارت نہ کر دیں۔

اس دوران میں دینِ اسلام — جسے قبول کرنے کی پاداش میں بلالؓ رات دن ماریں کھایا

کرتے تھے اور جس کا دائرہ کافی مدت تک ابو طالب کے قبیلے کے معدودے چند افراد تک محدود رہا۔ اب خشکی اور تری کو عبور کر کے شام، فلسطین اور فارس تک پہنچ چکا تھا۔ بلال رض کو تو اپنی آنکھوں سے سلطنت اسلامیہ کی یہ وسعت دیکھنے کا موقع نہ ملا البتہ ان کی اولاد نے یہ منظر ضرور دیکھا کہ اذان کی وہ آواز جسے پہلی بار ان کے والد نے مدینہ کی سنگلاخ زمین میں بلند کیا تھا اب ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اوقیانوس کے کناروں تک سنائی دینے لگی تھی۔

اپنے محبوب آقا کی جدائی کے بعد بلال رض نے اذان دینی بند کر دی تھی۔ کیونکہ انھیں رسول اللہ سے اتنا عشق تھا کہ ان کی طبیعت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ آواز جو خاص رسول اللہ کے لئے بلند ہوتی تھی اور جسے سن کر حضور نماز کے لئے تشریف لاتے تھے، آپ کی وفات کے بعد اسے کوئی دوسرا سنے۔ مدینہ اور شام کے قیام کے دوران میں لوگوں نے کئی بار ان سے اذان دینے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے ہمیشہ ہی انکار کر دیا۔ البتہ جب حضرت عمر رض دمشق گئے اور انھوں نے لشکر کی شدید خواہش کے پیش نظر بلال رض سے اذان دینے کی درخواست کی تو انھوں نے امیر المومنین کی خواہش کے احترام میں اسے منظور کر لیا اور یہ بلال رض کی آخری اذان تھی۔

جونہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ صبح کی اذان بلال رض دیں گے، تمام لشکر پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور ہر شخص دیوانہ وار مسجد کی طرف بھاگنے لگا کیونکہ طویل مدت کے بعد انھیں مؤذن نبوی کی زبان سے اذان سننے کی سعادت نصیب ہو رہی تھی۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ جونہی بلال رض کی آواز

ہوا کے پردوں کو چیر کر فضا میں گونجی تو تمام مجمع میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا اور لوگوں کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر پھر گیا جب رسول اللہ زندہ تھے اور بلالؓ مسجد نبوی میں آپ کے حجرے کے سامنے کھڑے ہو کر اذان دیا کرتے تھے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اس وقت مسجد نالہ و شیون کی مجلس میں تبدیل ہو گئی تھی اور حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھ بڑے بڑے دل گردے والے مجاہدین اسلام جنھوں نے ہولناک ترین جنگوں میں بھی حوصلہ نہ ہارا تھا۔ اور خطرناک موقعوں پر بھی ان کے پائے استقلال میں خفیف سی جنبش پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب صبر و شکیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تر ہو گئی تھیں۔

کاش اُس زمانے میں کوئی ایسا آلہ ہوتا جس کے ذریعے بلالؓ کی اذان ان کی خاص لے میں محفوظ کر لی جاتی اور موجودہ زمانے کے لوگ بھی اپنے کانوں سے ان رسیلے نغمات کو سن سکتے جنھیں صدر اوّل کے لوگ سن کر اپنے آپ کو محظوظ کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ ہمارے پاس کوئی ایسا یقینی ذریعہ تو نہیں جس کی بنا پر ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ آج کل کے مؤذنوں کی اذانیں کس حد تک بلالؓ کی لے کے مطابق ہیں تاہم چونکہ عرب اپنے دینی آثار کو محفوظ رکھنے کے لئے مشہور ہیں اس لئے عین ممکن ہے کہ انھوں نے نسلاً بعد نسل اسی طرز ادا کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہو جسے ان کے پیشروؤں نے بلالؓ سے سیکھا تھا خصوصاً اس صورت میں جب کہ بنی اسرائیل نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد سے بعض عبرانی نغمات کو بعینہٖ باقی رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ اگر

بنی اسرائیل ہزاروں سال سے ایک چیز کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو عرب کیوں نہیں ہو سکتے"؟ پس عین ممکن ہے کہ موجودہ اذان کے نغمات بھی انہی نغمات کے مشابہ ہوں جن کی ابتدا ار بلال رضؓ کے ذریعے ہوئی تھی۔

اہل مصر کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ آثار سلف سے بہت محبت رکھتے ہیں اور حتی المقدور انہیں محو نہیں ہونے دیتے۔ مصر حضرت بلال رضؓ کے زمانہ ہی میں فتح ہو گیا تھا اور اس سرزمین میں سب سے پہلے انہی لوگوں کی اذانیں گونجی تھیں۔ جنھوں نے اپنے کانوں سے بلال رضؓ کی اذان سنی ہوئی تھی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ آثار سلف سے شیفتگی کے باعث انھوں نے بلال رضؓ کی اس یادگار کو بھی بہت حد تک اس کی اصلی شکل میں محفوظ رکھا ہوا ہو۔

حرفِ آخر

صفحاتِ ماقبل میں لفکاڈیو ہیرن کے انگریزی مقالے کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جس سے قارئین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ مذکورہ مقالہ کس عقیدت کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس میں کیسے دلکش طریقے سے حضرت بلالؓ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ تاہم حضرت بلالؓ سے اپنی تمام تر عقیدت اور تحقیق کے باوجود لفکاڈیو ہیرن اپنے مقالے کو غلطیوں سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ لیکن اس نے دیگر مستشرقین کی طرح کسی بدنیتی کی بنا پر ایسا نہیں کیا بلکہ محض قلتِ فہم و تدبر کی بنا پر اس سے بلا ارادہ یہ غلطیاں صادر ہو گئیں۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم ان غلطیوں کی نشان دہی کر دینا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔

پہلی زبردست غلطی اس نے حضرت بلالؓ کی اولاد کا ذکر کر کے کی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ ابنِ ہشام نے صراحت سے ذکر کیا ہے، حضرت بلالؓ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ تاریخ

کی دیگر کتابیں بھی ان کی اولاد کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔

ایک اور فروگزاشت اس سے یہ ہوئی ہے کہ اس نے حضرت ابورویحہؓ کو حضرت بلالؓ کا حقیقی بھائی بتایا ہے۔ حالانکہ مستند روایات سے ثابت ہے کہ ابورویحہؓ ان کے حقیقی بھائی نہیں تھے بلکہ مہاجرین اور انصار کے درمیان سلسلۂ مواخاۃ قائم ہونے پر ان کے بھائی بنے تھے۔

ہیرن نے اپنے مقالے میں یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اہل عرب فن موسیقی سے نابلد تھے۔ کیونکہ ان کی زبانیں بعض آوازوں کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عرب میں مغنیوں کی اکثریت غیر ملکی غلاموں اور لونڈیوں پر مشتمل تھی کیونکہ وہ اس نقص سے پاک تھے۔ لیکن یہ دلیل درست نہیں کیونکہ عرب قوم آج بھی موجود ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زبانیں تمام آوازوں کو صحیح طور پر ادا کر سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ گانے بجانے کے شغل سے بہت حد تک علیحدہ رہتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے عورتوں کا مشغلہ خیال کرتے تھے۔ عرب ایک تجارت پیشہ اور جنگجو قوم تھی جس کا بیشتر وقت سفر اور لڑائیوں اور خانہ جنگیوں میں کٹتا تھا۔ وہ لوگ اپنے قبیلے کے کسی فرد کے متعلق یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ بدویانہ خصائل اور محنت و مشقت کی عادت کو ترک کر کے گانے بجانے کے کام میں مشغول ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ گانے بجانے کا کام لونڈیوں، غلاموں اور مخنثوں تک محدود تھا اور اسی لئے مغنیوں کی اکثریت غلام طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ورنہ اہل عرب کی آوازوں میں کوئی فنی کمزوری نہ پائی جاتی تھی۔ اس کا ایک

ثبوت یہ ہے کہ عربوں میں حُدی خوانی کا رواج کثرت سے ہے اور حُدی خوانی کا علمِ موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ رات کے سنّاٹے میں جب ہر طرف چاندنی نور پھیلا رہی ہوتی ہے۔ بدو عرب جس وقت حُدی خوانی کرتے ہیں تو سُننے والوں پر بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

تاہم اس وضاحت کے باوجود یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بلال رضؓ کو محض اس لئے اذان دینے کے کام پر مقرر کیا کہ وہ فنِ موسیقی کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اونٹ چرانے کا کام کیا ہو اور حجاز سے یمن اور شام کے سفروں کے دوران میں حُدی خوانی سے بھی گہری واقفیت حاصل کر لی ہو لیکن کسی روایت سے ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ اُنھوں نے اسلام سے قبل یا اس کے بعد دوسرے غلاموں کی طرح گانے بجانے کے کام میں بھی حصہ لیا ہو۔ دراصل ان کی آواز بہت بلند تھی اور دور دور تک کے لوگ اسے بآسانی سُن لیتے تھے۔ اسی لئے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انھیں اذان دینے کے کام پر مقرر کیا۔ ان کے غیر معمولی تقویٰ، عبادت سے شغف اور مسجد میں ان کی ہر وقت موجودگی کو دیکھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظر اس اہم کام کے لئے ان ہی کی طرف پڑی اور اُنھوں نے بھی بڑے خلوص اور وفاداری سے یہ خدمت سرانجام دی۔

(محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور)

بلالؓ

عبّاس محمود العقّاد

ترجمہ

شیخ محمد احمد پانی پتی

ادارہ فروغِ اردو، لاہور